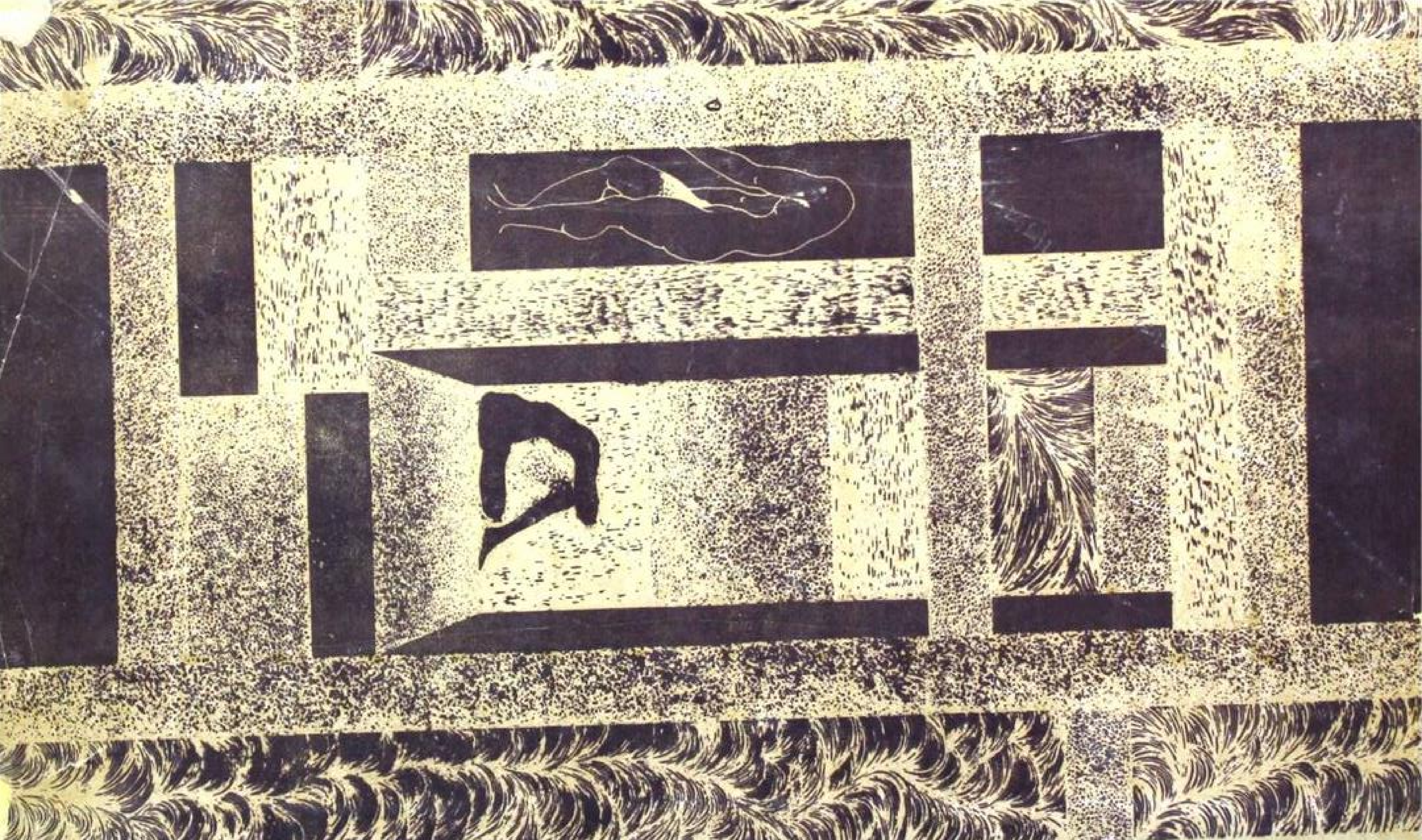

پرائے چہرے

ذکیہ مشہدی

پرائے چہرے

(افسانوں کا مجموعہ)

ذکیہ مشہدی

(اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے)

تخلیق کار : ——————— ذکیہ مشہدی

کتابت : ——————— ممتاز احمد

طباعت : ——————— لیبل آرٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ ۶

قیمت : ——————— ۲۰ روپے

بار اول : ——————— ایک ہزار

سال اشاعت : ——————— جولائی ۱۹۸۴ء

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

ملنے کے پتے : ———

(۱) ۱۸۷، راؤز ایوینو
نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۲

(۲) مکتبۂ ادب، ۵/۱۴ گردنی باغ
پٹنہ - ۸۰۰۰۰۱

(۳) بک ایمپوریم، سبزی باغ
پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴

انتساب

اپنے مشفق چچا

لئیق احمد صدیقی مرحوم

کے نام

ذکیہ مشہدی

فہرست

۱	پیش لفظ	۵
۲	چرایا ہوا سکھ	۹
۳	تھکے پاؤں	۱۸
۴	جگنو	۳۰
۵	ایک تھکی ہوئی عورت	۳۶
۶	پرائے چہرے	۴۲
۷	پائل	۵۰
۸	آنٹی ایملی	۵۹
۹	نروان	۷۳
۱۰	وہ ایک صبح	۹۲
۱۱	مٹھی بھر گھاس	۱۰۱
۱۲	شکستہ پروں کی اُڑان	۱۰۸
۱۳	کالے میگھا پانی دے	۱۱۷
۱۴	تیسری راکھی	۱۲۴
۱۵	ٹوٹا ہوا خط	۱۳۱
۱۶	کاغذی رشتہ	۱۳۸

پیش لفظ

میرے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ گرچہ میری فطرت میں افسانہ نگاری کے جراثیم کم عمری سے ہی موجود تھے لیکن چونکہ شدید قسم کی لاپرواہی اور لاأبالی پن بھی مزاج کا حصہ تھے اس لئے میری افسانہ نگاری کی عمر جتنی ہونی چاہیے تھی، اس سے بہت کم ہے یعنی صرف سات آٹھ برس۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ہر لکھنے والا کسی نہ کسی واقعے یا حادثے سے متاثر ہو کر لکھنے لگتا ہے۔ سب شاعروں اور ادیبوں پر یہ عمومی اصول لاگو کرنا کہاں تک صحیح ہے یہ میں نہیں کہہ سکتی لیکن میری باضابطہ افسانہ نگاری کے پیچھے یقیناً ایک حادثہ موجود ہے اور وہ ہے میری شادی - اب اگر میں بات یہاں ختم کردوں تو آپ کا ذہن خطرناک بلکہ خوفناک تصوّرات بُننے لگے گا اس لئے ضروری ہے کہ شادی کو حادثہ کہنے کی جرأت کی

وضاحت کر دوں۔

میرا تعلق مغربی یو۔پی کے متوسط طبقے کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ گھر کا ماحول علمی تو تھا لیکن ادب سے کسی کو کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ پھر یہ کہ "کسی" کے تحت بہت سے لوگ تھے بھی نہیں۔ سارے قریبی عزیزوں کے سرحد پار چلے جانے کی وجہ سے میری پرورش بہت ہی مختصر کنبے میں ہوئی۔ زندگی کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گذرا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک ریسرچ پروجکٹ میں ایک مختصر سی مدت کے لئے کام کیا اور پھر ایک اور مختصر مدت کے لئے ایک کالج میں۔ یہ دونوں دور اور ان سے پہلے تعلیم کا سلسلہ۔ یہ ساری مدت لکھنے پڑھنے، تفریح اور شرارتوں کا ایسا ACTION PACKED پروگرام تھی کہ نہ تو وقت گذرنے کا احساس ہوتا تھا اور نہ کسی چیز کی طرف سنجیدگی سے غور کرنے کا۔

شادی کے بعد میں اپنی ملازمت نہیں جاری رکھ سکی اور گرچہ زندگی اب بھی دلچسپ تھی اور اپنے کھٹے میٹھے تجربوں کے ساتھ شاید کچھ زیادہ خوبصورت بھی لیکن ذہن کو غذا نہیں مل رہی تھی اور چند گوشے کہیں تشنہ رہ گئے تھے۔ پھر وقت بھی بہت

۱۔ شوہر شفیع مشہدی (جن کا نام آپ کے لئے

نامانوس نہیں ہے) ڈرامہ نویسی، افسانہ نگاری، شاعری اور کامیاب ایڈمنسٹریٹیو سروس کا حیرت انگیز امتزاج تھے۔ ان کے بڑے بھائی بدیع الزماں شہدی بدیع الزماں کے نام سے عرصے سے ہندی میں لکھ رہے تھے۔ دلی میں رہنے والے بہار کے اس مشترکہ خاندان میں ادب کا خاصہ دخل تھا اور یہ ماحول میرے لیے بہت سازگار ثابت ہوا۔ میری ان صلاحیتوں کی آبیاری ہوئی جو بصورت دیگر شاید دبی ڈھکی ہی رہ جاتیں۔ اس ماحول کی فراہمی اور پھر براہ راست ہمت افزائی، ان دونوں کے لیے میں اپنے شوہر کی ممنون ہوں۔

میرا خیال ہے کہ کامیاب افسانہ نگاری کے لیے حساس دل، وسیع تجربے اور الفاظ پر قدرت یہ تینوں ضروری ہیں۔ حساس دل تو میرے پاس ہے (آپ نہ مانیں تو بھی میں اس پر اصرار کروں گی) لیکن تجربہ بہت وسیع نہیں ہے۔ جہاں تک الفاظ کا سوال ہے اس کا فیصلہ قارئین پر ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ ان تک پہونچ سکا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔ کسی بھی مصنف کی کامیابی یا ناکامی کا ایک ذہین قاری سے زیادہ بہتر جج اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ویسے یہ بتا دوں کہ میں دانستہ

طور پر پلان بنا کر یا سوچ سمجھ کر کبھی نہیں لکھتی۔
جب ہی لکھا ہے جب دل کسی واقعے یا کیریکٹر سے
بہت متاثر ہوا ہو اور جس کے متعلق دوسروں کو
بتانے کو دل چاہا ہو کہ "ایسا بھی ہوتا ہے" اور
"لوگ یوں بھی جیتے ہیں" یہ واقعات اور کیریکٹر
اگر قارئین کو متاثر کر سکے تو میں کامیاب ہوں۔ مجھے
ان کے ردعمل کا انتظار رہے گا۔

ذکیہ مشہدی

چُرایا ہوا سُکھ

ہمیشہ کی طرح آج بھی اجیت نے سونے سے پہلے کافی کا پیالہ ختم کیا، پھر دو تین سگریٹ پھونکے لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے امیتا کے گرد بازوؤں کا حلقہ نہیں بنایا۔ بہت دیر تک وہ چھت کی طرف یونہی بے مقصد دیکھتا رہا۔ انتظار کرتے کرتے جب امیتا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ خود ہی قریب آ گئی اور اجیت کی چوڑی چھاتی پر بالوں کا آبشار بکھر گیا۔ اجیت کو نتھنوں میں چبھن کا احساس ہوا۔ توں توں کرتے ہوئے اس نے بال پیچھے ہٹائے مگر امیتا کسی ضدی بچے کی طرح اس سے چمٹی رہی۔

"اجیت ڈارلنگ، جب تک میں تمہارے قریب نہ آ جاؤں، مجھے نیند نہیں آتی۔"

"یہ بال تو پیچھے کرو۔ ناک میں گھسے آتے ہیں۔" اجیت کچھ جھنجھلا کر بولا۔ "آخر تم بال باندھ کر کیوں نہیں سوتی ہو؟"

اسے مسز کھنہ کے بغیر مانگ کے اونچے بنے ہوئے بالوں کی کس کر باندھی ہوئی چوٹی یاد آ گئی۔ ایک دن جب وہ گئی رات ان کے یہاں ٹسٹ میچ کا اسکور پوچھنے گیا تھا تو مسز کھنہ سونے کی تیاری کر رہی تھیں۔ سادہ بچے بالوں اور سخت گوندھی ہوئی چوٹی میں ان کا بیضوی چہرہ اور تیکھے نقوش زیادہ واضح ہو اٹھے تھے۔ بڑی چور سی مسکراہٹ اجیت کے ہونٹوں پر پھیل گئی —

امیتا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آج یہ نئی بات کیسی۔ اجیت ہی تو کہتا

تھا کہ اسے امیتا کے گھنے بال کھلے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں۔ پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں تھا۔ وہ رات کو اپنا سر اس کی چوڑی چھاتی پر ٹکاتی تو اجیت کی انگلیاں دیر تک اس کے بالوں میں الجھی رہتیں۔

"تمہیں نے تو کہا تھا" وہ دھیرے سے بولی "کہ رات کو بال کھلے رکھا کرو۔"

"میں نے؟ میں نے کب کہا تھا؟" اجیت صاف مکر گیا۔

تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟ متفکر ہو؟ امیتا نے ہولے سے سر اس کے سینے سے ہٹا لیا۔ بالوں کو سمیٹتے ہوئے پہلے اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا پھر نرم نرم ہونٹ ٹکا دیے۔ اجیت کی جھنجھلاہٹ غصے میں تبدیل ہونے لگی مگر وہ خاموش رہا۔ یہ عورت کی ذات اگر شک میں مبتلا ہو جائے تو اس کی سانسوں تک میں زہر گھل جائے گا۔ کالے ناگ کی طرح زہر اگلتی، فوں فوں کرتی، ناچتی پھرے گی۔ کب کس کو ڈس لے۔

امیتا کی انگلیاں اس کے بالوں میں گھوم رہی تھیں۔ لانبی لانبی نرم انگلیاں۔ اسے میٹھی سی خنکی کا احساس ہوا۔ نیند دھیرے دھیرے غلبہ پا رہی تھی۔ کبھی آنکھیں کھلتیں، کبھی بند ہوتیں۔ نیند کی آتی جاتی ترنگوں میں مسز کھنہ کا چہرہ کبھی اوپر آتا کبھی نیچے جاتا۔ امیتا کیسی اچھی ہے، موڈ پہچانتی ہے، اجیت کو متفکر دیکھا تو خاموشی سے ہٹ گئی۔ ہوگا کوئی آفس کا مسئلہ۔ زیادہ سے زیادہ اس نے یہی سوچا ہوگا۔ اجیت کے دل میں سویا ہوا پیار پل کے پل جاگا۔ جب سے اس کے مکان کے اوپر والے حصہ میں مسز کھنہ آ رہی تھیں، یہی ہو رہا تھا۔ امیتا کے لئے کبھی اس کا دل جھنجھلاہٹ سے بھر اٹھتا، کبھی غصے سے اور کبھی پیار سے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ان احساسات کو کس خانے میں رکھے۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے خوبصورت دو منزلہ مکان کی اوپری منزل سے اس موٹے ان کلچرڈ مارواڑی کرایہ دار کو ہٹا پایا تھا۔ سارے ڈرائنگ روم میں کیلیں ٹھونک ٹھونک کر لال پیلے کلنڈر لٹکا رکھے تھے، اوپر سے کبھی لوکی کے چھلکوں کی بارش

ہوتی، کبھی شریفے کے بیجوں کی اور کبھی صرف راکھ کی۔ بدتمیز نیچے لان پر کھلے ہوئے گلاب توڑے جاتے۔ نوکر سلیقے سے تراشی ہوئی گھاس پر ان کے دو مہینے کے ننھے منے سے پوتڑے پھیلا جاتا۔ ”اوپر دھوپ نہیں آتی جی“ وہ دانت نکوس کر کہتا۔ سیٹھ کی بیوی امیتا کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتی۔ ”تم مانس مچھی کھاتی ہو، ہم ٹھہرے سا توک بھوجن والے“ وہ ناک چڑھا کر کہتی اور اجیت غصے سے لال پیلا ہو جاتا۔ بڑی مشکلوں سے جان چھوٹی۔ سَرن کے توسط سے نئے کرایے دار آئے تو اجیت کو لگا کہ یہ دار نہیں آئے بلکہ ڈرائنگ رُوم کے لئے ڈیکوریشن پیس خرید آ گیا۔ کھنہ صاحب تو اسمارٹ تھے ہی، ان کی بیوی کا بھی جواب نہ تھا۔ واہ، واہ، واہ! گوری بھی بہت سی عورتیں ہوتی ہیں، لانبی بھی بہت ہوتی ہیں، تیکھی سی، چھوٹی سی ناک بھی بہت سی عورتوں کی ہوتی ہے مگر ان تمام چیزوں کا صحیح امتزاج اور اس امتزاج کا صحیح استعمال شاید سب میں نہیں ہوتا۔ جیسے قورمے کی بنیادی ترکیب تو ایک ہی ہوتی ہے، کچھ مرچیں، کچھ گرم مصالہ، کچھ دہی، کچھ پیاز، نرم ملائم گوشت، لیکن ان کا صحیح امتزاج کچھ ہی لوگوں کو آتا ہے ورنہ ہر باورچی کے پکائے ہوئے سالن کے ذائقے میں فرق کیوں ہوتا۔ اجیت کا دل چاہتا ذرا اس ہانڈی کو بھی سونگھ کر دیکھے۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات —— بس اجیت کے ذہن میں یہ مصرعہ یوں ہی گونجتا رہتا تھا۔ جیسے کسی پرانے ریکارڈ پر سوئی آ کر اٹک جائے۔ بلائے جان ہے غالب۔ بلائے جان ہے غالب — نیند سے بوجھل آواز میں غیر شعوری طور پر پھر وہ یہی گنگنانے لگا —

دھت تیری کی۔ امیتا سوچنے لگی ابھی جھنجھلا رہے تھے، ابھی غالبؔ کا شعر پڑھنے لگے۔ پھر کان کھانا شروع کر دے گی۔ ہے بھگوان؟ تو نے عورت کیوں بنائی۔ اس نے آنکھوں کے کونوں سے چور انداز میں جھانک کر دیکھا۔ امیتا تقریباً سو چکی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اچھا ہے سو گئی۔ اب کم از کم جاگتی آنکھوں کے خوابوں پر پہرہ تو نہیں بٹھائے گی۔

مسز کھنہ کی ناک میں پڑی ہوئی ہیرے کی جگر جگر کرتی لونگ پھر اندھیرے میں کوندنے لگی۔ اجیت آج کل کچھ زیادہ ہی کنفیوزڈ ہو رہا تھا۔ کل کی بات —— امیتا نے کہا تھا:

" اجیت ڈارلنگ ذرا مسز کھنہ سے ان کا کافی پرکولیٹر تو مانگ لاؤ میں ذرا نہانے جا رہی ہوں " اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھوٹی سی پلاسٹک کی ٹرے پر تو جانے کیا کیا ڈھیر تھا۔ کریم کی شیشیاں، شیمپو، نیل وائل، کلینزنگ ملک، اُبلتے ہوئے پانی کا جگ....

تو امیتا تفصیل سے نہانے جا رہی ہے۔ ایک گھنٹے کی چھٹی۔ مارے خوشی کے اجیت نے اس کے گال پر چٹکی بھری اور ایک ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہونچ گیا۔ دیوان پر دراز مسز کھنہ فلم فیئر کی ورق گردانی کر رہی تھیں اور اپنے سجے سجائے ڈرائنگ روم کا ایک حصہ ہی معلوم ہو رہی تھیں۔

ہائی ــــ انھوں نے اپنے موتی جیسے دانت چمکا کر کہا۔

مسز کھنہ! وہ بات یہ ہے کہ امیتا کو .....

انھوں نے بات کاٹ دی۔ " دیکھیے ہم لوگوں کو ایک دوسرے کو جانتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں اور ابھی تک اس قدر تکلف برتتے ہیں۔ میرا نام شیلا ہے "

"بات یہ ہے "..... اجیت ان کا نام لیتے ہوئے ہکلا گیا۔

" بات وات کچھ نہیں۔ شیلا کہیے تب ہی سنوں گی "

"اچھا تو شیلا جی " ــــ اجیت کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس اُبلتے ہوئے احساس کو کیا نام دے۔ خون کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا ــــ " شیلا جی۔ میں اس لئے آیا تھا کہ امیتا کو آپ کا کافی پرکولیٹر چاہیے "

" ضرور ــــ وہ تو میں دے ہی دوں گی لیکن پہلے آپ یہاں جو کافی پی لیں " اور انھوں نے نوکر کو آواز دی۔ اجیت سنبھل کر بیٹھ گیا پھر گئیں چلیں تو چلیں۔ ساتھ بیٹھنے کے مواقع تو بہت آتے تھے مگر ایک طرف تو کھنہ جی ہوتے تھے دوسری طرف امیتا۔ یہ موقع شاید اپنی نوعیت کا دوسرا ہی تھا۔ تنہائی کا پہلا موقع آیا تھا تو تکلف کی دیوار خاصی موٹی تھی۔ اس مرتبہ اس میں رخنے پڑتے دکھائی پڑ رہے تھے۔ شاید اگلی بار ایسا موقع آئے تو کچھ اور رخنے پڑیں اور پھر شاید بیٹھ ہی جائے ــــ ہوں۔ بلّی کے خواب میں چھیچھڑے۔ چھی چھی

یہ میں کیا سوچ رہا ہوں، امیتا جیسی بیوی کے ہوتے ہوئے ـــ اجیت نے خود پر لعنت بھیجی چاہی ہی تھی کہ ان کا نوکر کافی لیکر آگیا۔ بھلا مسز کھنہ کو خود اٹھ کر پیالہ پڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ قریب آکر جھکیں تو ان کے گہرے کٹے ہوئے بلاوز کا گریبان کچھ اور نیچا ہو گیا۔ اور بڑی مدھم، بڑی پیاری سی خوشبو اجیت کی ناک سے ٹکرا کر اس کے حواس پر سوار ہو گئی اور اس وقت تک سوار رہی جب تک امیتا نے نیچے سے ہانک نہیں لگائی۔

"میں نے کہا، میں نے تو صرف پرکولیٹر منگایا تھا۔ تم خود کافی بنانے بیٹھ گئے کیا؟"

امیتا کے لہجے میں فطری خوش مزاجی سے پیدا ہونے والی شوخی تھی مگر اجیت کے دل میں چھپے چور نے اس کو گھور کر دیکھا۔ یہ خوش مزاجی سچّی ہے یا جھوٹی؟ جملہ کھرا ہے یا طنز میں ڈوبا ہوا۔ اس کا ذہن ترازو لیکر امیتا کو تولنے لگا۔ وہ پرکولیٹر لیکر کچن میں گھس گئی۔

"ستو میتو ـ مسز کھنہ پوچھ رہی تھیں کہ آپ کی مسز نے انٹیریر ڈیکوریشن میں کوئی ڈپلومہ لیا ہے کیا؟ آپ کا گھر بے حد سلیقے سے سجا ہوا ہوتا ہے۔"

امیتا کا مسرور چہرہ کچن سے جھانکا۔ اجیت نے اطمینان کا سانس لیا۔ بھگوان تیرا شکر ہے۔ عورت بنائی تھی سو بنائی تھی لیکن اگر اسے عقل بھی دیدی ہوتی تو مجھ جیسے مردوں کو تو مر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا۔ اطمینان کا سانس لیتا ہوا وہ تولیہ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ جسم پر صابن رگڑتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ مسز کھنہ کی بے تکلفی کو کس خانے میں فٹ کرے۔ محض خوش مزاجی، صاف دلی ـــ یا کہیں ـــ کہیں ان کے دل میں بھی نرم گوشے جاگ رہے ہیں۔ اجیت کے دل میں انار چھوٹنے لگے۔ صابن رگڑ رگڑ کر اس نے آدھا کر دیا۔ وہ تو شاید پورا ہی گھس دیتا اگر امیتا کافی تیار ہو جانے کی اطلاع نہ دیتی۔

قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے ـ اجیت نے نرمی سے سوئی ہوئی امیتا کا بازو گلے سے ہٹاتے ہوئے سوچا۔ دیکھیں گے اس ہانڈی کا قورمہ کیسا ہے۔ وہ اپنی باریک تراشی ہوئی مونچھوں میں مسکرایا۔

صبح اجیت کی آنکھ کھلی تو امیتا چائے کی ٹرے لئے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔

بستر کے پاس تپائی رکھ کر اس نے چائے رکھی اور نازک سنہری پیالیوں میں چائے ڈھالنے لگی۔ اجیت کا ڈریسنگ گاؤن اس کے سرہانے ٹنگا ہوا تھا۔ سلیپر مسہری کے نیچے موجود تھے۔ امیتا کے چہرے پر بڑی میٹھی سی مسکراہٹ تھی۔ رات کی تلخ گفتگو وہ یکسر بھول چکی تھی۔ اس کے تازہ شیمپو کئے ہوئے بالوں سے ہلکی ہلکی خوشبو آرہی تھی۔ اجیت نے پھر اپنے اوپر لعنت بھیجی۔ کیسی اچھی بیوی ہے۔ بھلا میں کہاں پرائی عورت کے چکر میں پڑ رہا ہوں۔ لیکن چائے پی کر نیند کا خمار اترا تو حواسوں پر وہی آٹھ انچ کے کٹے بلاؤز کا گلا ناچ گیا۔ مسز کھنہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لان پر کھڑی تھیں۔

"میں نے کہا اجیت جی۔ شام کو فرصت ہو تو شام کو چائے اوپر ہی پی لیجئے گا۔ کھنہ صاحب آج ٹور پر جا رہے ہیں۔ مجھے تنہا چائے پینا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

اجیت کو لگا اس کے سر پر ایک ایسا بم پھٹا جس میں رنگ برنگے تارے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سارے تارے اب اس کی آنکھوں کے سامنے متحرک رہے تھے۔

"آپ آرہے ہیں نا؟" مسز کھنہ نے دوہرایا۔

"شام کو امیتا کی سہیلی کی شادی کی سالگرہ ہے۔ ہم دونوں وہاں مدعو ہیں۔" اجیت بڑی مری ہوئی آواز میں بولا۔

وہ اپنی نقرئی ہنسی ہنس کر بولیں۔ "تو یہ تقریب تو امیتا جی کی سہیلی کی ہوئی۔ آپ کی سہیلی کی تو نہیں۔ آپ انہیں جانے دیجئے۔ ہم لوگ چائے پئیں گے۔"

اجیت بالکل ہی حواس باختہ ہو گیا۔ یہ سوا تیرے پر آیا ہوا آفتاب اس کے سر پر گر رہا ہے کیا؟

شام کو اجیت نے سر درد کا بہانہ کیا۔ ثبوت کے طور پر وہ امیتا کو دکھا کر اے۔پی۔سی کی دو ٹکیاں اکٹھی کھا گیا۔ "میتو ڈارلنگ تم چلی جاؤ۔ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ ہے۔ تمہارا جانا ضروری ہے۔ میں ذرا آرام چاہتا ہوں۔ کچھ متلی سی بھی معلوم ہو رہی ہے۔"

امیتا کا سیدھا سادا چہرہ فکر سے بھر اٹھا۔ آفس کینٹین سے الٹا سیدھا کھا لیا

ہو گا کچھ میں نے جو چکن سینڈوچ دیے تھے وہ بدمعاش انور کھا گیا ہو گا - تم فوراً ڈاکٹر مسکینہ کو فون کر لو - تم بھلا کیا کرو گے - لاؤ میں ہی کر دیتی ہوں - زیادہ تکلیف ہو تو میں بھی نہیں جاؤں؟"
وہ حسب عادت ایک سانس میں بولتی چلی گئی -

مارے غصے کے اجیت کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگیں - اس کا بس چلتا تو امیتا کی ایک ایک بوٹی علیحدہ کر دیتا - ناک الگ، کان الگ، آنکھیں الگ، بازو الگ - اور سب کو بالکل علیحدہ علیحدہ دفن کرتا تاکہ وہ کبھی ایک جگہ ہو کر پھر امیتا کی شکل اختیار نہ کر سکیں -

غصہ دبا کر جلدی سے بولا:

"نہ نہ تم ضرور جاؤ ڈارلنگ - میں صرف ہنگامے سے بچنا چاہتا ہوں - سر میں درد کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں - پھر بائیں آنکھ دبا کر بولا - ویسے رکنا چاہو تو رک بھی سکتی ہو - ہم بھی اپنی شادی کی سالگرہ آج ہی منا لیں گے - بالکل دلہن نظر آ رہی ہو"

امیتا فکر بھول کر ہنسنے لگی -

"بدمعاش! اچھا آرام کرو" اور ایک ہوائی بوسہ پھینکتی ہوئی باہر نکل گئی -

اس کے جاتے ہی اجیت نے کمبل پھینکا - آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور حسب معمول ایک قدم میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چڑھ گیا -

ڈرائنگ روم میں سناٹا تھا - ڈرائنگ روم سے متصل بیڈ روم سے مسز کھنہ کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی - "بالم آئے بسو مورے من میں"

اس نے پکارا "شیلا جی"!

"یس، کم اِن" کھنکتی ہوئی آواز میں جواب ملا -

وہ جھجکا - ان کے بیڈ روم میں وہ کبھی داخل نہیں ہوا تھا -

"آئیے بھئی، کیا سوچ رہے ہیں" کھڑکی کا پردہ اٹھا - مسز کھنہ کی ناک کی لونگ جگمگائی -

اجیت اندر داخل ہوا - کمرے کی ہر چیز میاں بیوی کے نفیس ذوق اور آرام طلب

مزاج کی غماز تھی - اس نے ایک نظر مسز کھنہ پر ڈالی - وہ بے نیازی سے بالوں میں برش پھرا رہی تھیں - تقریباً بیک لیس چولی سے ان کی سنہری کمر جھانک رہی تھی - اجیت پر پھر وہی دورہ پڑا - جی چاہا انہیں چھو کر دیکھے - کچھ لوگ اصلی نہیں معلوم ہوتے - تخیل کا واہمہ محسوس ہوتے ہیں -

"آپ کی خاطر میں نے امیتا کو تنہا بھیج دیا" اجیت 'آپ کی خاطر' پر زور دیتا ہوا بولا —

"تھینک یو اجیت جی - آپ بے حد اچھے انسان ہیں - بے حد اچھے - یقیناً آپ کی بیوی خوش قسمت ہے جو آپ جیسا شوہر ملا - ایک کھنہ جی ہیں روز ٹور - روز ٹور - پتہ نہیں یہ سارے ٹور آفیشیل ہوتے ہیں یا پردۂ زنگاری میں کسی معشوق کو چھپا رکھا ہے" اجیت کی تعریف کرتے ہوئے مسز کھنہ کی آواز میں طنز کا شائبہ بھی نہ تھا - بے حد اپنائیت تھی اور وہ بے حد قریب آ کر سیدھے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں - اس کو اپنے چہرے پر ان کی سانسوں کے لمس کا احساس ہوا اور اس کے اندر خون شراب بن کر جھاگ دینے لگا۔

عورت اور مرد کے اس ازلی رشتے کا یہ کمزور لمحہ کب اور کیسے ان کے درمیان سرک آیا - اجیت کچھ سمجھ ہی نہیں سکا - جب مسز کھنہ کے بازو اس کے گلے سے علیحدہ ہوئے تو اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ہارا ہوا جواری ہے - مسز کھنہ کا کاجل پھیل گیا تھا اڑے ہوئے پاؤڈر کے دھبے برص کے داغ لگ رہے تھے - لپ اسٹک ہونٹوں کے درمیانی حصے سے غائب ہو کر باچھوں میں بھر گئی تھی - ان کے چہرے پر وہی طمانیت تھی جو موٹا سا چوہا پا جانے والی بلی کے چہرے پر ہوتی ہے -

بڑی حیرت سے آنکھیں پٹپٹا کر اجیت نے سوچا کہ یہ عورت اُسے اس قدر انوکھی، اچھوتی، آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق کیوں معلوم ہوئی تھی - یہ عورت جو کسی بھی عام عورت سے الگ نہیں ہے - کیا یہ چرایا ہوا سکھ امیتا سے ملنے والے سکھ سے کچھ الگ تھا؟ حساب لگایا تو سارے جمع خرچ، ضرب، تقسیم کا جواب ایک ہی آیا - پھر بھلا

چھ مہینوں سے اس نے اپنی نیندیں کیوں حرام کر رکھی تھیں ؟ محض بند لفافے کو کھولنے کے لیے ؟ ایک بیمار سے تجسّس کی تسکین کے لیے ؟ یا اس لیے کہ وہ ایک ناقابل حصول شئے محسوس ہوتی تھیں اور اجیت کے لیے ایک چیلنج ؟ اُسے امیتا یاد آئی جو اب آتی ہی ہوگی - ایک سیدھی سادھی، معصوم سی گھریلو بیوی جیسے وہ پچھلے چھ ماہ سے ٹھگتا چلا آرہا تھا - وہ آہستہ سے اٹھا اور ان کا ڈریسنگ گاؤن ان پر ڈالتا ہوا نظریں چار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا -

پارٹی سے لوٹ کر رات کو جب امیتا میک اپ اتارنے کے بعد اپنے بالوں کو کس کر چوٹی میں گوندھ رہی تھی تو اجیت نے اپنا چہرہ اس کے شانوں میں ڈبوتے ہوئے کہا:

" میتا ! ان بالوں کو کھلا رہنے دو - یہ ایسے ہی اچھے لگتے ہیں - پھر دن میں ان سے کھیلنے کا موقع ملتا بھی کہاں ہے ؟ "

تھکے پاؤں

رتنا کو جانکی کٹیر ڈھونڈنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ تقریب کا گھر ویسے بھی دور سے پہچانا جاتا ہے۔ بڑی ہی سادہ لیکن قیمتی آرائش تھی۔ اس نے دل ہی دل میں میناکشی کے گھر والوں کے ذوق کی داد دی۔

گیٹ پر استقبال کرنے والوں کا ہجوم بھی اتنا ہی تھا جتنا مہمانوں کا۔ لیکن وہ صرف میناکشی کی بڑی بہن کو پہچانتی تھی جو ایک مرتبہ کالج کے کسی فنکشن میں آئی تھیں۔ رتنا کو دیکھ کر وہ آگے بڑھیں اور بڑے خلوص سے اس کو اندر لے گئیں۔ سہیلیوں میں گھری میناکشی نے دور سے نعرہ لگایا "ہلو مس! آپ آگئیں۔ سو ویری سویٹ آف یو" اس کے چہرے پر حقیقی خوشی کی جھلک نظر آئی۔ میناکشی کی بہن اسے وہاں چھوڑ کر مڑ رہی تھیں کہ اس نے انہیں مخاطب کیا۔ "نیلو دیدی آپ مس کو لیجا کر دو چار لوگوں سے انٹروڈیوس کرا دیجیے ورنہ یہاں ہم لوگوں کے بیچ میں تو یہ بور ہی ہو جائیں گی" اور وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ننھے سے آئینے میں دیکھ کر اپنا ٹیکہ درست کرنے لگی۔

برات اپنی جگہ سے میناکشی کے گھر کے لئے روانہ ہو چکی تھی اس لئے اس کا سنگار تقریباً مکمل تھا بس فائنل ٹچیز دیے جا رہے تھے۔ اس کی ہم عمر لڑکیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ خوش رنگ قیمتی کپڑے پہنے وہ اس کے گرد تتلیوں کی طرح تھرک رہی تھیں۔ باہر لان اور گیٹ کو چھوڑ کر باقی ساری جگہوں کی روشنیاں پوشیدہ تھیں۔ روشنی کا سرچشمہ نظر

نہیں آرہا تھا لیکن بڑی راحت انگیز روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کے کسی ایسے ہی پوشیدہ ذریعے نے میناکشی کا چہرہ بھی روشن کر رکھا تھا۔ رتنا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ٹھیک تو ہے وہ اپنے سے تقریباً پندرہ بیس برس چھوٹی ان لڑکیوں کے درمیان رہ کر نہ صرف خود بور ہوگی بلکہ انہیں بھی بور کرے گی۔ اس نے اپنے ساتھ لایا ہوا تحفہ میناکشی کے ہاتھ پر رکھا اور اپنی میزبان کے پیچھے ہولی۔ وہ اسے لیکر لان پہ آگئیں جہاں قناطیں لگاکر مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا اور دولہا کے لئے خوب اونچا پھولوں بھرا پلیٹ فارم اور منڈپ بنے ہوئے تھے۔

"معاف کیجیے گا مس کشور میں ذرا جلدی میں ہوں" انھوں نے تیزی کے ساتھ دو چار نام دوہرائے یہ ہیں مسز کھنہ، یہ مسز ماتھر، یہ مسز درانی، یہ مسز جھا۔ اور یہ رہیں میناکی سب سے فیورٹ ٹیچر مس کشور۔۔۔ وہ تعارف کچھ ادھورا سا چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔ مہمانوں کا تانتا تھا کہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"تو مسز کشور، آپ میناکشی کے کالج میں کون سا سبجیکٹ پڑھاتی ہیں؟" زیوروں سے لدی ایک قدرے حسین خاتون نے سوال کیا۔

"پولیٹیکل سائنس۔ اور معاف کیجیے گا میں مس کشور ہوں۔ مس رتنا کشور۔" اس نے ہولے سے کہا۔۔۔ دوسری تینوں خواتین نے جو اس جھرمٹ میں تھیں لمحے بھر کو اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ شادی شدہ عورتوں کی آنکھوں کے اس لمحاتی، بے حد لمحاتی مگر برچھی کی طرح چبھ جانے والے ردعمل کی وہ عادی ہوچکی تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھار وہ اس کو ذرا سا ہلا دیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

رتنا کے آجانے سے باتوں کا جو سلسلہ ٹوٹا تھا، اس کا سرا انھوں نے پھر پکڑا۔

"مسٹر کھنہ باہر گئے ہوئے ہیں، ورنہ وہ ضرور آتے۔ آفیشل ٹرپ تھا ملتوی کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔"

"پچ پچ" دوسری خاتون بولیں۔ "تو یہ روپ سنگھار آج بیکار ہی گیا۔ آج تو

آپ دُلہن سے ٹکرا رہی ہیں۔" اور انھوں نے بڑا پھوہڑ سا قہقہہ لگایا۔

"ہاں میرا بیٹا بھی کہہ رہا تھا کہ کھنہ آنٹی آج بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ بائی دی وے، آج بیٹے کو حرارت تھی مگر زبردستی کر کے ساتھ آگیا۔ بارہ برس کا ہو گیا مگر اس قدر شریر ہے....."

رتنا نے ذرا چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بات کرنے والی خاتون کی عمر اس سے کافی کم نظر آرہی تھی، مگر وہ اپنے بارہ برس کے بیٹے کا ذکر کر رہی تھیں۔ ٹھیک تو ہے اگر اگلے سال میناکشی کے یہاں بیٹا ہو جائے تو بارہ برس بعد میناکشی صرف اکتیس [۳۱] بتیس [۳۲] برس کی ہوگی جبکہ وہ خود اب اڑتیس کی پوری ہو چکی ہے۔ اگر اس کی اپنی شادی وقت سے ہوئی ہوتی تو.....

اسے یوں گُم صُم دیکھ کر ایک خاتون نے درمیان سے شوہر اور بچوں کی بات کاٹ دی اور جیسے ترس کھا کر اُسے بھی گفتگو میں شریک کرنا چاہا۔

"تو میناکشی نے پولیٹیکل سائنس لیا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

سوال بڑا بے تُکا اور غیر اہم تھا اور قطعی آؤٹ آف کانٹیکسٹ۔ "جی ہاں" اس نے مختصر سا جواب دیا اور ازراہِ اخلاق گفتگو جاری رکھنے کے لئے ان کے جڑاؤ نیکلس کی تعریف کر دی ـــــ

وہ کھِل اُٹھیں۔ یہ میرے شوہر بمبئی سے لائے تھے۔ ان کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہی ہے۔ جب جاتے ہیں میرے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لے آتے ہیں۔

رتنا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس کے جواب میں کیا کہے۔ باقی تینوں خواتین زیورات پر گفتگو کرنے لگیں جو ان کے شوہروں کو پسند تھے یا ناپسند۔ مسٹر کھنہ کو بھاری زیورات ناپسند تھے، ماتھر صاحب کو پسند۔ مسٹر درانی بیوی کے لئے زیورات کا انتخاب خود کرتے تھے جبکہ مسٹر چھابڑا نے یہ معاملہ مکمل طور پر مسز چھابڑا پر چھوڑ رکھا تھا ویسے ان کا کہنا تو تھا کہ مسز چھابڑا کو زیورات کی قطعی ضرورت نہیں ہے، وہ ویسے ہی حسین لگتی ہیں۔ رتنا احمقوں کی طرح کھڑی سب سن رہی تھی۔ کتنی یکساں ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ چہرے اس کے لئے اجنبی تھے لیکن باتیں اجنبی نہیں تھیں۔ یہ باتیں وہ ہر جگہ سنتی آئی تھی۔ اسٹاف روم میں، گھر پر، شادی، بیاہ، منگنی،

سالگرہ، ہر تقریب میں عورتیں بس یہی باتیں کرتی نظر آتی تھیں۔ میرا گھر، میرے بچے، اچار کی ترکیبیں، مٹھائیوں کے نسخے، شوہر کی محبت یا بے اعتنائی۔

اچانک مسز درانی کو رتنا کا خیال آگیا اور انھوں نے گفتگو کا دھارا اس کی طرف موڑ دیا — "تو آپ میناکشی سے ملیں؟"

وقفے وقفے سے یہ خواتین اپنے انتہائی مہذب ہونے کا ثبوت دیتی ہیں اور اپنی دنیا سے باہر نکل کر اپنی دانست میں ایسے سوالات کر لیتی ہیں جو اس کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ وہ شادی شدہ عورتوں کی ان مہربانیوں کی بھی عادی ہو چکی تھی۔

"جی ہاں مل لی" اس نے اکتایا ہوا سا جواب دیا اور گردن اونچی کر کے گیٹ کی طرف دیکھنے لگی جہاں اچانک برات کے آنے کا غلغلہ بلند ہوا تھا اور دلہن کو جے مالا کے لئے باہر لایا جا رہا تھا۔ رسم ختم ہوئی تو وہ خواتین جانے کدھر کھو چکی تھیں۔ میناکشی کو دولہا کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ رتنا کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی۔ اتھاہ سمندر کے درمیان ایک تنہا بوند۔

شادیوں میں جانا اسے سخت ناپسند تھا۔ وہ ان میں شرکت کرتے کرتے اکتا چکی تھی۔ پہلے اس نے ہم عمر سہیلیوں کی شادیوں میں شرکت کی۔ پھر اس نے ان لڑکیوں کی شادیوں میں شرکت کی جو اس سے چھوٹی تھیں اور اب ان کی باری تھی جو اس کے سامنے پیدا ہوئی تھیں۔ مثلاً اس کے وطن میں اس کی پڑوسی سیتا چاچی کی چھوٹی بیٹی رُدیا۔ بابا کے پرانے دوست ریاست حسین ایڈوکیٹ کی بیٹی زرینہ اور چھوٹے ماما کی بیٹی وِدّیا۔ ان سب کی پیدائش اسے اچھی طرح یاد تھی۔ رُدیا کی پیدائش میں سیتا چاچی مرتے مرتے بچی تھیں۔ زرینہ پیدا ہوئی تو بڑی کالی سی تھی جس پر ریاست چچا نے کہا تھا "ایک تو بیٹی اس پر کالی" (لو جی! ان کی کالی کلوٹی بھی بمنٹ گئی) رہی وِدّیا تو دائی نے نہلا دھلا کر اسے سب سے پہلے رتنا کی گود میں ہی دیا تھا۔ ماما ڈلیوری کے لئے اسی کے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ اب کسی شادی میں شریک ہونے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ کم سن لڑکیاں اس کی ساتھی نہیں تھیں (وہ رتنا کہیں کھو گئی تھی جو ان کا ساتھ دے سکتی تھی۔ چنچل، خوش و خرم، بات بے بات قہقہہ لگانے والی، دانتوں

تلے انگلی دبا کر فلمی ہیروؤں کا ذکر کرنے والی، کسی بھی عام لڑکی جیسی رتنا) - اور شادی شدہ عورتوں میں وہ حدِ فاصل بن جاتی تھی مگر میناکشی اس کو بہت عزیز تھی اس لئے وہ جی کڑا کر کے اس کی شادی میں آ گئی تھی اور اب کرب کے ان لمحات سے گزر رہی تھی جو ہر محفل ہر ہنگامے میں اس کا مقدر بن جاتے تھے -

کالج میں بھی یہی حال تھا - اسٹاف میں ویسے تو کئی کنواریاں تھیں لیکن ایک کو چھوڑ کر باقی سب بہت کم عمر تھیں - کسی کی منگنی ہو چکی تھی کسی کا "اسٹیڈی" بوائے فرینڈ موجود تھا اور جس کا یہ سب نہیں تھا اس کی کم از کم امیدیں برقرار تھیں اس لئے کہ خواب دیکھنے کی عمر ابھی باقی تھی - رہیں مس اسٹیفن تو وہ بہت بوڑھی تھیں اور اب تمام پچھتاوؤں اور احساسات سے اوپر اٹھ چکی تھیں ان کی پھیکی آنکھوں میں گہری بے نیازی کا تاثر تھا - صرف وہ تھی جو ترشنکو کی طرح نہ آکاش میں تھی نہ دھرتی پر - بس بیچ میں لٹک رہی تھی - شادی شدہ لکچررز، کنواری لڑکیوں کو چھیڑتیں - پہلے اسے بھی چھیڑا جاتا تھا لیکن اب کوئی کچھ نہیں کہتا تھا - چھیڑے سے کب گدگدی ہوتی ہے اور کب تکلیف، یہ ان جہاں دیدہ عورتوں کو معلوم تھا -

مہمانوں کو ڈنر کے لئے کہا جا رہا تھا - میناکشی کی بہن اسے ڈھونڈتی ہوئی آئیں اور اسے ٹیبل پر بٹھا گئیں جہاں دولہا دلہن بیٹھے تھے - ابھی پھیرے نہیں ہوئے تھے - دولہا بڑا ہنس مکھ، گورا چٹا سا نوجوان تھا - میناکشی کی طرف بڑی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ اس کے لئے کھانا نکال رہا تھا - میناکشی کانٹے میں تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا پھنسا کر بڑی نفاست سے کتر رہی تھی اور کنکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جا رہی تھی - رتنا کو دھکا سا لگا - وہ میناکشی کی بے نیازی کی عادی نہیں تھی - مگر یہ بالکل فطری ہے - اس نے دل کو سمجھایا - اگر وہ اس وقت مجھ کو توجہ دے تو یہ بڑی غیر فطری بات ہوگی - قطعی ابنارمل اور میناکشی کے اور اس کے تعلقات میں ابنارملٹی کا کہیں شائبہ بھی نہ تھا وہ ایک ذہین اور محنتی طالبہ تھی اور رتنا ایک ذہین محنتی اور مخلص ٹیچر - اس لئے دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھیں -

خاموشی سے کھانا ختم کر کے رتنا اٹھنے لگی -

"بس کھا چکیں آپ ؟ یہ مٹر پلاؤ اور لیجئے گرم گرم" میناکشی نے یکایک چونک کر بڑا رسمی سا جملہ کہا۔ تو اس نے بھی چند لمحے اس کے لئے وقف کئے۔ آخر وہ اس کی چہیتی ٹیچر جو تھی۔ رتنا کو ایسا لگا کہ اب میناکشی کا رویہ بھی ان مہربان شادی شدہ عورتوں جیسا ہو گیا ہے جو اپنی گفتگو میں اس کے لئے زبردستی جگہ بناتی ہیں تاکہ وہ اجنبی نہ بنی رہے۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"نہیں مینا" اس کا لہجہ خاصہ خشک تھا۔ "اب میں چلوں گی۔ گاڈ بلیس یو ٹو" دولہا کی طرف ایک روکھی سی مشفقانہ مسکراہٹ پھینک کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میناکشی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ اس وقت رتنا نے پہلی مرتبہ اس سے اتنی بے رُخی سے بات کی ہے۔ وہ پھر اس جادو میں گم ہو گئی جو کسی نوجوان کی بھرپور توجہ ملنے پر ایک لڑکی کے سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔

ہوسٹل آکر رتنا نے کمرے کی لائٹ آن کی۔ کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گئی۔ ہلکی سی خنکی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے پائنتی پڑی دلائی سرہانے کھینچ لی اور سائڈ ٹیبل پر پڑے ہوئے خطوط کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کئی روز کی چھٹیوں کے بعد ڈاک آئی تھی اس لئے اکٹھے چار خط تھے جو چپراسی عین اس وقت دے گیا تھا جب وہ میناکشی کے یہاں جانے کو تیار ہو رہی تھی۔

پہلا خط امّاں کا تھا۔ وہی پرانا مضمون۔ بابوجی کی بیماری۔ بھیا کی گھٹتی آمدنی اور بڑھتے خرچ۔ ان کی اپنی گٹھیا کی شکایت۔ نئی خبر صرف یہ تھی کہ بھیا کے یہاں پھر بیٹی ہوئی تھی۔ یہ ان کی تیسری بیٹی تھی اور بھیا بابوجی کی طرح ہی تھے۔ قانع، کاہل، بغیر کسی جد و جہد کے حالات کے دھارے پر بہنے والے۔ اس نے خط تپائی پر رکھ دیا۔ دوسرا خط انشورنس کمپنی کی طرف سے تھا اور تیسرا صوفیہ کا تھا۔ صوفیہ اس کی رازدار سہیلی تھی اور پابندی سے خط لکھا کرتی تھی۔ وہ واحد ہستی تھی جس کے ساتھ بیٹھ کر اسے مکمل رفاقت کا احساس ہوتا تھا۔ دونوں میں طالب علمی کے زمانے سے ہی اس قدر دوستی تھی کہ ایک مرتبہ پرنسپل پیرٹیل نے کہا تھا کہ بڑھتی عمر کی دو کنواریوں کے درمیان اس قدر دوستی مناسب نہیں ہے۔" اس کے

دماغ میں سوا گندگی کے کچھ نہیں، نفسیات پڑھ رکھی ہے نا" صوفیہ نے دانت کچکچا کر کہا تھا۔

صوفیہ کو سروس بھی رتنا کے ہی کالج میں ملی تھی لیکن پھر اسے بمبئی کے کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے بڑا اچھا آفر ملا تھا اور وہ وہاں چلی گئی تھی۔ وہ بھی مڈل کلاس فیملی کی لڑکی تھی۔ اور پیسہ اس کے لئے اہم تھا۔ اس کے جانے کے بعد رتنا کو شدید تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ تھی تو پتھر جیسے بھاری وقت میں کچھ روزن بن جاتے تھے۔ شام کو کسی ریستوران میں چائے پی لی۔ ساتھ ساتھ شاپنگ کر لی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی۔ دونوں ساتھ بیٹھتیں تو نہ جانے کس کس کے قصے نکلتے۔ موٹی مسز واڈیا کے جو ہر وقت جمشید، جمشید کرتی رہتی تھیں جیسے جمشید شوہر نہ ہو چھوٹا بھائی ہو۔ مسز خان کے قصے جو تھیں تو چھپکلی جیسی مگر خود کو مِس انڈیا سمجھنے پر مُصر تھیں، مِس اندرا تکو کے قصے جو ابھی نئی نئی پرائمری سیکشن میں آئی تھی اور بڑے دھڑے سے ایک چپراسٹرین لڑکے سے رومانس لڑا رہی تھیں۔

"آج کل کی لڑکیوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے" رتنا کہتی۔ "میں ایسا کرتی تو بابوجی اپنا وزنی جوتا اتار کر اتنی مرمت کرتے کہ عشق کا بھوت میرے سر سے ہی نہیں شاید پورے قصبے سے بھاگ نکلتا" مگر کئی بار رتنا نے رات میں خواب دیکھا تھا کہ وہ خود کمسن، گوری، نازک اندرا ہے اور وہ چپراسٹرین لڑکا اس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔ کئی بار رتنا نے یہ بھی سوچا کہ اگر بابوجی کم عمری میں اس قدر پابندیاں نہ لگاتے تو وہ شاید آج ایسی بدطینت اولڈ میڈ نہ بن گئی ہوتی۔ صوفیہ کا معاملہ کچھ دوسرا تھا۔ اس کی شادی جس لڑکے سے بچپن میں طے تھی وہ صوفیہ کی بدقسمتی سے پڑھنے میں بہت اچھا نکلا۔ آئی، پی، ایس میں منتخب ہو گیا اور یوں پھر سے اُڑا کر صوفیہ اور اس کے والدین کو حیرت کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ یہ پورے مڈل کلاس کی بدقسمتی ہے کہ جہاں کوئی لڑکا اچھا نکلتا ہے اپر کلاس والے اس کو بھاری قیمت لگا کر اُچک لیتے ہیں اور آپ منہ تاکتے رہیے۔ چچا ریاست حسین جیسے جوڑ توڑ والے انسان تو کم ہی ہوتے ہیں۔ زرینہ اٹھارہ کی پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ انھوں نے اسے بیاہ دیا۔ رتنا نے کہا۔ "کیوں چچا بی۔ اسے تو کرنے دیتے" انھوں نے جواب دیا تھا

"بیٹا ایک اُلّو پھنس گیا ہے۔ کھاتا پیتا، پلا ہوا پھر ملے نہ ملے۔ اور ملے تو ہو سکتا ہے یہ زرینہ ہی انکار کردے۔ پڑھ لکھ کر بیٹا کالی کلوٹیوں کے دماغ بھی ساتویں آسمان پہ پہونچ جاتے ہیں" اور اب شادی اور پھر بچے کے بعد اسی کلوٹی زرینہ پر کیسا روپ چڑھا تھا۔ چچا واقعی گرگِ باراں دیدہ تھے۔

"پوجا کی چھٹیوں میں گھر جا رہی ہوں۔ ایک زمانہ ہوا گھر گئے۔ پھر تم سے ملنے کو بھی بڑا جی چاہتا ہے۔ اگر تمہارا کوئی پروگرام نہ ہو تو تم بھی آجاؤ" صوفیہ نے لکھا تھا۔

"پروگرام" یہ لفظ رتنا کے لئے اپنے معنی کھو چکا تھا۔ یہاں تو وہی حال تھا کہ نہ ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے۔ سال میں اکّا دکّا پکچر دیکھ لی۔ کوئی اچھا سا ناول پڑھ لیا۔ بھیّا کی بچیوں کے لئے کسی نئے ڈیزائن کا سوئٹر تیار کردیا۔ پھر اللہ اللہ خیر صلا۔ ٹھیک ہے صوفیہ بیگم آجاؤں گی گھر تمہاری خاطر۔ اس نے زیر لب کہا اور چوتھا خط اٹھایا۔ اٹھایا۔ پھر رکھا۔ پھر اٹھایا۔ اسے چھوتے ہوئے رتنا کو کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر بچھو بند ہوں یا پھر وہ پنڈورا کا بکس ہو جس کے کھلتے ہی آفتیں نازل ہو جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کہ اس خط کے اندر کیا ہے۔ وہ چند منٹ آنکھیں بند کرکے لیٹی رہی۔

خط مانک چند کا تھا۔ مانک سے اس کی ملاقات کوئی دو برس پہلے کسی کی معرفت ایک تقریب میں ہوئی تھی اور تب سے وہ اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا رنڈوا تھا۔ دو جوان لڑکیاں تھیں۔ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ رتنا کو نہ اس کی ادھیڑ عمر پر اعتراض تھا نہ گنجے پن پر اور نہ دو جوان لڑکیوں کا باپ ہونے پر۔ اب اس عمر میں کنوارا اچھوتا پری زادہ تو ملنے سے رہا۔ مگر رتنا ہتھے سے اس لئے اکھڑ گئی تھی کہ مانک اس سے خفیہ شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کی دوسری شرط یہ تھی کہ ان کے یہاں بچے نہیں ہوں گے۔ "لوگ کیا کہیں گے۔ لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں" ایک مرتبہ اس نے بڑی کھسیانی صورت بنا کر کہا تھا۔ "ان کے رشتے بھی آرہے ہیں۔ سال دو برس میں دونوں کو ساتھ ہی بیاہ دوں گا۔ پھر اب باقاعدہ بیوی کا جھنجھٹ پالنے کی عادت بھی نہیں رہی" وہ

اور زیادہ چند نظر آنے لگا تھا۔ "تم کان پور میں رہنا نوکری کی ضرورت نہیں ہے۔ گزارہ پورا دوں گا۔"

رتنا سرخ ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ "آج سے آپ یہاں دکھائی نہ دیں۔" اس نے مضبوطی سے کہا تھا تب سے مانک دکھائی تو نہیں دیا تھا مگر خط ضرور لکھتا رہتا تھا۔ ہر مرتبہ اس کے خط میں ایک نیا جھانسہ ہوتا تھا۔ "ہنی مون کے بہانے پورا ہندوستان گھما لاؤں گا۔ کان پور والا مکان تمہارے نام کر دوں گا۔ کسی کو کانوں کان پتہ بھی نہیں لگے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ رتنا سوکھی لکڑی کی طرح جل اٹھی۔ پہلے تو اتنی شرطیں لگاتا ہے گنجا جیسے میں اس سے شادی کرنے کو مری جا رہی ہوں پھر جھانسے دیتا ہے۔ کبھی کبھی اسے مانک کا خط دیکھ کر رونا آ جاتا۔ اتنی بڑی دھرتی۔ اتنے سارے بھانت بھانت کے لوگ۔ ان میں سے بھگوان نے یہی اُلو اُتارا تھا اس کے نام پر۔ تیسرے خط کے بعد سے اس نے اس کے خط بغیر پڑھے پھاڑنے شروع کر دیے تھے مگر آج نہ جانے کیوں من گھونسلے سے بھٹکے ہوئے پنچھی جیسا ہو رہا تھا۔ شاید میناکشی کے رویے نے کہیں خراش ڈالی تھی۔

جی کڑا کر کے اس نے خط کھول لیا۔ "یہ میرا آخری خط ہے۔ اس کا جواب پندرہ دن کے اندر مل جانا چاہیے۔ ورنہ میں کوئی دوسرا ٹھکا ڈھونڈنا شروع کر دوں گا۔ دنیا میں عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ دو ہفتے میں فیصلہ کر لو۔ پھر چاہے خط لکھ دینا چاہے فون کر دینا۔ ایک بار پھر دوہرا دوں کہ کان پور کا مکان ...... وغیرہ وغیرہ۔

رتنا کو جیسے دھکا سا لگا۔ اُسے مانک سے اس مضبوط لہجے کی توقع نہیں تھی۔ شاید مانک کے خطوط اس کو چڑانے کے ساتھ ساتھ کہیں اندر اندر ایک ہلکی سی طمانیت بھی بیدار کرتے تھے حالانکہ اُسے اس کا احساس نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں مانک کے لئے ایک خاص مردانہ گالی اُبھری۔ مگر اس بار اس نے خط پھاڑا نہیں۔ بے پروائی سے اٹھا کر تپائی پر ڈال دیا۔

رتنا گھر پہنچی تو اماں نے پانی کی بیک دیوار پر تھوکتے ہوئے بتایا کہ صوفیہ کل آنے والی ہے۔ اس کے بھائی سے بابوجی کی ملاقات ہوئی تھی۔ رتنا خاموشی سے سامان

کھولنے لگی ——

"کیوں بولتی کیوں نہیں ؟ چار پیسے کماتی ہے تو اس ماں سے بھی اکڑتی ہے جس نے پیدا کیا ہے" اماں ہمیشہ سے کڑوا کریلا تھیں۔ بوڑھی ہو کر اور نیم پر چڑھ گئیں۔

"کیا بولوں اماں۔ سن تو لیا کہ صوفیہ آ رہی ہے" وہ رسان سے بولی۔ اگر کہیں وہ کہتی کہ وہ محض صوفیہ کی خاطر ہی یہ دھول بھرا سفر کر کے آئی ہے تو اماں جانے کتنی آفت مچاتیں۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہیں۔

بھیا کی دو سالہ لڑکی لونی لگی دیواروں سے مٹی کھرچ رہی تھی۔ آنگن میں گملے کا چارا بکھرا پڑا تھا۔ برآمدے کے کچے فرش پر جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ دروازوں کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ کھڑکیوں کی سلاخیں زنگ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح رتنا کا جی چاہا کہ وہ اس گھر کو بہت بڑے پھاوڑے کی ایک ہی ضرب سے اکھاڑ کر ہتھیلی پر رکھ لے اور پھونک مار کر اڑا دے۔ پھر کہیں سے اللہ دین کا چراغ مل جائے۔ وہ اس کو رگڑے۔ دھواں اٹھے دیو برآمد ہو اور پوچھے! مانگ کیا مانگتی ہے اور رتنا کہے! بس ایک ڈھنگ کا مکان، محل دو محلہ نہیں لیکن ...... اس نے آنکھیں ملیں باورچی خانے سے دھوئیں کا بادل اٹھ کر سیدھا اس کی آنکھوں میں گھسا تھا۔ بھابھی انگیٹھی سلگا رہی تھیں۔

دوسرے دن صوفیہ آ گئی اور اس کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر پاؤں پسارے بیٹھی جانے کہاں کہاں کی گپیں ہانکنے لگی۔ وہ ہمیشہ سے باتونی تھی۔ باتونی اور ہنس مکھ۔ فرسٹریشن نے اسے اتنا ڈاؤن نہیں کیا تھا جتنا رتنا کو۔ مگر اس بار رتنا نے دیکھا کہ اس کی ہنسی میں کچھ زیادہ جان تھی۔ بڑھتی عمر سے چہرے پر آ جانے والی کرختگی میں واضح کمی تھی۔ اور خلاف عادت اس نے لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔

"کیوں رتن بائی پوچھا نہیں کہ بھلا میں نے لپ اسٹک کیوں لگا رکھی ہے؟" اس نے اچانک کہا۔

"پوچھنے ہی والی تھی"

"اُسے بہت پسند ہے۔" اس نے رتنا کو آنکھ ماری۔

"کسے؟" رتنا کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی اچانک زور زور سے بجنے لگی۔

"آصف کو۔"

"یہ کون بزرگوار ہیں؟"

"کون ہیں یہ نہ پوچھو۔ بس ہیں۔" اور اس کے بعد صوفیہ کی گفتگو آصف کے گرد تیز رفتاری کے ساتھ گھومنے لگی۔ آصف کسی فرم میں کام کرتا تھا۔ عمر میں صوفیہ سے چار پانچ برس چھوٹا تھا مگر بری طرح عاشق ہو گیا تھا۔ دونوں پابندی سے ملتے تھے۔ آصف کو لپ اسٹک بہت پسند تھی۔ کھانے میں تلی ہوئی مچھلی مرغوب تھی۔ وہ ہمیشہ سفید کپڑے پہنتا تھا۔ اس کی پانچ بہنیں تھیں۔

"شادی کب کر رہی ہو؟" رتنا کو یہ سوال پوچھتے ہوئے اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔

"شادی؟ اس پر تو میں نے غور نہیں کیا۔ وہ بھی ہو جائے گی۔ شاید نہ ہو۔ نہ ہوئی تو کیا فرق پڑے گا۔ زندگی جینے کے لئے ہے۔ میں اچھی طرح جی رہی ہوں۔ آصف نے برش لیکر خالی کینوس پر ست رنگی دھنک بنائی ہے۔"

آصف۔ آصف۔ آصف۔ اکتوبر کی اس اداس دوپہر کو صوفیہ کی آواز کسی مشین کی گھوں گھوں کی طرح اور اداس بنا گئی۔ رتنا کو اچانک محسوس ہوا وہ ایک درخت کی نصف کٹی ہوئی شاخ ہے جو دھم سے نیچے آنے ہی والی ہے یا وہ ایک ایسا پرندہ ہے جس کا نشیمن جل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے یا کچھ نہیں تو ایک ایسی پجارن ہے جس کا آخری بُت بھی ٹوٹ چکا ہے۔

چھٹیاں گذار کر رتنا ہوسٹل واپس جا رہی تھی تو بس میں راستے بھر اس کو ڈر لگتا رہا کہ کہیں مانک کا خط ادھر ادھر نہ ہو گیا ہو۔ اس میں اس کا پوسٹل ایڈریس تھا اور فون نمبر بھی۔

دھڑکتے دل سے اس نے کمرہ کھولا اور ڈرتے ڈرتے کمرے پر نظریں دوڑائیں۔ خط اپنی جگہ موجود تھا۔ اس نے کھول کر اُسے دوبارہ پڑھا۔ مانگ کا دیا ہوا وقت ابھی گذرا نہیں تھا۔

فون نمبر ایک پرچے پر لکھ کر وہ کالج کے آفس میں آئی۔ اُس کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور آواز میں نمی۔ بڑے بابو کی طرف جُھک کر بولی "میں ایک فون کر لوں ذرا؟"

جگنو

ڈاکٹر شمیم اسلم کا دل پہلے ذرا تیزی سے دھڑکا، پھر یکایک ایک سکنڈ کو رک گیا۔ ہاں وہ جگنو ہی تھا۔ انھوں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ شرارہ جلا، پھر بجھا۔ پھر جلا۔ کسی شوخ کی پھلجھڑی کی طرح چھوٹتی ہنسی جیسا۔ انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ فزکس کی پروفیسر تھیں اور فزکس اس طرح کے واقعات کو محض اتفاق قرار دیتی ہے۔ فزکس جس کے سامنے صرف وہی سچ ہے جو ٹھوس ہے، مادی ہے اور جس کو ناپ سکیں، تول سکیں، تجربہ گاہ میں لیجا کر ٹکڑے ٹکڑے کر سکیں۔ سیال بنا کر بہا دیں، بھاپ بنا کر اڑا دیں۔ یہ دل ول کے معاملات۔ لاحول ولا قوۃ — مگر اب دل تھا بھی کہاں، جو تھا وہ ٹکڑے بن کر بکھر گیا، پھر سیال بن کر بہا اور پھر بھاپ بن کر اڑ گیا۔ اب یہ جو دھڑکے جاتا ہے یہ تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے — لاحول ولا قوۃ — پھر وہی دل — فزکس کی پروفیسر کو دل سے سروکار شمیم بیگم — ؟

جگنو پھر چمکا۔ آسمان پر گھنے بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا اور شام اندھیری تھی۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ شاید۔ ہاں شاید۔ کہیں کسی نے اندر سے انہیں بڑی زور سے ڈانٹا۔ کیا شاید شاید لگا رکھی ہے۔ پچیس برس پہلے جس رشتے کی ڈور کٹ چکی وہ اب یہ جگنو استوار کرے گا؟ دماغ خراب ہوا ہے؟

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اس میں برسات کی بھینی خوشبو تھی۔ شگفتہ ہریالی

کی خوشبو۔ گھنے اودے بادلوں اور اندھیرے میں پڑتی پھوار کی خوشبو۔ اور اس خوشبو میں خنکی یوں بھری تھی جیسے ماں میں ممتا۔ کسی اندرونی کرب نے انہیں بے قرار کر دیا۔ وہ کمرہ کھول کر ٹیرس پر نکل آئیں۔ سیاہ بادلوں میں کوڑا مارتی ہوئی بجلی یہاں سے وہاں تک دوڑ رہی تھی۔ پل بھر کو انہیں محسوس ہوا کہ انھوں نے جس ریاض کے ساتھ اس مشکل مضمون میں اتنی بڑی ڈگری لی تھی وہ بالکل بیکار تھا۔ نرا کھوکھلا۔ پچیس برس تو دل کی ننھی سی مٹھی میں یوں آ جاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگ۔ ایک نظر ڈالی اور اندر جھانک لیا۔

پچیس برس پہلے لکھنؤ یونیورسٹی کے کیلاش ہوسٹل کے ڈبل سیٹیڈ کمرے میں اُن کی ادم میٹ ایلا چودھری نے اچانک چونک کر ان سے کہا تھا۔ "ارے شمیمہ دیکھ جگنو، کمرے کے اندر جگنو!" تو کیا ہوا۔ وہ جھنجھلا کر بولی تھیں۔ ایک مشکل سا فارمولا ان کے ذہن پر سوار تھا اور کل کے کلاس میں پروفیسر مکھوپادھیائے نے پورا پیریڈ اس کی وضاحت میں صرف کر دیا تھا لیکن اس نے کھوپڑی میں گھسنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں 'وہ' مزے سے آلتی پالتی مار کر دل میں، دماغ میں، رگوں میں لہو میں ہر جگہ کسی آکٹوپس کی پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا تھا اور فارمولے ڈر کر بھاگنے لگے تھے۔

ارے واہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اگر کمرے میں جگنو آ جائے تو بڑا اچھا شگون ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لو پھر کوئی دعا مانگو اور آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اگر جگنو ابھی کمرے میں موجود ہے تو سمجھو دعا قبول ہو گئی۔ اور ایلا نے جھٹ آنکھیں بند کر لی تھیں اور نہ جانے کون سی دعا مانگی تھی۔ کتاب بند کر کے انھوں نے چاروں طرف دیکھا۔ جگنو ابھی چم چم کر رہا تھا۔ واہموں پر ان کا یقین نہیں تھا اور مذہب سے بھی وہ کچھ اکھڑی رہتی تھیں۔ کائنات کے اس پار نہ جانے کون ہے، کیسا ہے مگر اس وقت کے سارے شکوک، سارے وسوسے نہ جانے کہاں بھاگ گئے۔ انھوں نے ایلا کی تقلید میں جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں اور دعا مانگی۔ "کاش مجھے پتہ چل جائے اس کے دل میں کیا ہے۔ اے خدا اُسے بھی ایسا ہی دیوانہ بنا دے۔ کمبخت خط لکھتا بھی ہے تو ایسے کہ دل کی بات ذرا سمجھ میں نہ آئے۔ لندن

کے موسم کی، لینڈ لیڈی کی چھوٹی بچی کی شرارتوں کی، پیرس کے ٹریپ کی، ہندوستان کی
یادوں کی۔ نہیں لکھتا تو یہی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ کہیں کسی گوشے میں اس لڑکی کے لئے
بھی کوئی جگہ ہے جو بچپن سے اس کو چاہتی چلی آرہی ہے۔ منہ بند ہندوستانی لڑکی۔ بہت
دنوں سے اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا ہے۔ ارے او جگنو ذرا اللہ میاں سے جاکر کہہ دینا کہ
اسے ذرا صاف صاف بات کہنے کی توفیق دیں۔ اور کل ہی اس کا خط آجائے تو کیا مزا آئے۔"

اتنی لمبی چوڑی دعا مانگ کر ڈاکٹر شمیمہ اسلم نے جو اس وقت تھرڈ ائر کی دھان
پان نازک سی ۱۸ سالہ طالبہ تھیں، آنکھیں کھولیں تو جگنو ابھی کمرے میں تھا۔ پل بھر کو وہ خوش
ہوگئیں پھر انھوں نے کتاب پر نظریں جمائیں اور وہ سوکھا سڑا فارمولا رٹنا شروع کر دیا۔
صبح تک جگنو والی بات دماغ سے نکل چکی تھی۔

سہ پہر کو چائے کے وقت میٹرن نے صبح کی ڈاک تقسیم کی۔ ڈاک میں سب سے
آخر میں رہ گیا تھا وہ لمبا سا ائرمیل والا لفافہ جس پر یو۔ کے کی مہر تھی۔ شمیمہ اسلم۔ میٹرن
نے پکارا اور ان کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ وہ "اسی" کا خط تھا اور اس
نے پہلی مرتبہ اپنی محبت کا اعتراف کیا تھا۔ دبے دبے الفاظ میں۔ لیکن جو کچھ تھا وہ بہت
ٹھوس تھا اور بالکل واضح۔ اٹھارہ سالہ شمیمہ ہوا میں اڑنے لگی تھی۔

تب ہندوستانی لڑکیاں محبت میں خود سے پہل نہیں کرتی تھیں۔

شمیمہ نے روایت سے بغاوت کی تھی۔ وہ گھر کی پہلی لڑکی تھی جو گریجویشن کے لئے
گھر سے باہر آئی تھی اور ہوسٹل میں رہ رہی تھی وہ یوں بھی پہلی لڑکی تھی کہ اس نے فزکس اور
میتھمیٹکس جیسے مضمون لئے تھے۔ تب یہ مضمون لڑکوں کی میراث سمجھے جاتے تھے۔ مگر محبت میں وہ
بالکل روایتی لڑکی تھی۔ اس وقت کی روایت کے مطابق وہ لڑکوں سے زیادہ ذہین، نہیں
ہوتی تھی اور اس نے ساتھ کے کھیلے 'ابن عم' سے ہی محبت کی تھی اور محبت کے اظہار کے
لئے اسی کی 'پہل' کا انتظار کیا تھا۔ وہ روایت اور روایت سے بغاوت کا بڑا انوکھا
امتزاج تھی۔ تب وہ لڑکی تھی نازک سی دھان پان سی ۔۔۔ اس کے سر میں ایک طرف فزکس

اور ریاضی تھے اور دوسری طرف، رُومان ـــ اور تب ۔ تب شریف لڑکیاں صرف ایک ہی شخص سے محبت کیا کرتی تھیں ۔

تب ـ تب ـــ کیا تب تب نکار کھی ہے ۔ ڈاکٹر شمیمہ اسلم نے شمیمہ کو ڈانٹا ۔ مگر وہ بڑی ہی ضدی لڑکی تھی ۔ دماغ کے کنگرے پکڑ کر اس نے پھر جھانکنا شروع کر دیا ۔

اس خط کے بعد اس کے خط پابندی سے آنے لگے تھے اور شمیمہ کو فارمولے یاد کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا تھا ۔ کمبخت دماغ سے پھسل پھسل جاتے تھے ۔ اور پھر جیسے اچانک وہ خط آیا تھا، ہوتے ہوتے آنے والے خطوط کے بعد ۔ اسی طرح خطوں کی رفتار کم بھی ہونے لگی ۔ پھر ایک بار کوئی تین مہینے تک کوئی خط نہیں آیا ۔ بیٹھے بیٹھے شمیمہ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو جاتے ۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا ۔ پردیس کا معاملہ ٹھہرا ۔ وہ بیمار ہو، کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو اطلاع کون دے گا ؟ ایسی ہی وسوسوں اور اُداسی بھری رات کو اُس نے ایلا سے کہا تھا ـــ ایلا ! جھاڑی میں چمکنے والے جگنوؤں کو دیکھ کر دعا مانگنے سے دعا قبول نہیں ہوتی کیا !

"نہیں ـــ" وہ بڑی بے دردی سے بولی تھی ۔ جھاڑیوں میں، میدانوں میں تو ہمیشہ ہی جگنو رہا کرتے ہیں ۔ خاص بات تو جب ہوتی ہے جب جگنو کمرے میں گھس آئے اور شمیمہ کا ننھا سا دل ٹوٹ گیا ۔ اب پہلے جگنو کے کمرے میں گھس آنے کی دعا کرنی ہو گی ۔ وہ روزانہ کمرے کی کھڑکی کھول دیا کرتی ۔ رات کے سناٹے میں ہوسٹل کالج و دق لان ڈوب جاتا ۔ کمروں کی روشنیاں گل ہو جاتیں ۔ صرف چوکیدار کے ڈنڈے کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی اور دور کہیں اُلّو کی ہُو ہُو ۔ ایلا کے خراٹے کمرے میں گونجتے ۔ سارا ماحول بڑا ڈراؤنا لگتا ۔ سامنے نرگس کے پودوں پر جگنو آنکھ مچولی کھیلتے ۔ چم ۔ چم ۔ چم ۔

ایسی ہی ایک رات کو جب وہ جاگ رہی تھی تو کسی شہاب ثاقب کی ننھی سی کرچ جیسا جگنو کمرے میں گھس آیا اور پھر چمک چمک کر واپس جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگا ۔ شمیمہ خوشی سے ہزار پنکھڑیوں والے کنول کی طرح کھل گئی ۔ اُس نے جھٹ آنکھیں مُوند لیں

اور جلدی سے دعا کی "وہ اچھا ہو — خیریت سے ہو — مجھے بھولا نہ ہو — اس کا خط آئے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ وہ اچھا ہو۔ وہ اچھی طرح ہو —" اس نے بے صبری سے آنکھیں کھول دیں۔ جگنو ابھی کمرے میں تھا۔ شمیمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

تیسرے دن اس کا خط بھی ایسے ہی آیا جیسے آسمان سے تارا ٹوٹے اور گود میں آ رہے۔ وہ اچھا بھلا تھا اور شمیمہ کو بھولا نہیں تھا۔ تب ہی تو اس نے ایسی خوشی کے موقعے پر یاد رکھا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے پیرس میں چھٹیاں گزارتے ہوئے اس کی ملاقات ایک پاکستانی بزنس مین کی فیملی سے ہو گئی تھی اور وہ لوگ اسے ایسے بھائے تھے کہ گھر والوں کی شرکت کی پروا کیے بغیر اس نے وہیں ان کی بیٹی سے شادی رچا لی تھی اور اب فرداً فرداً سب کو اطلاع دے رہا تھا۔

اس نے شمیمہ کو لکھا تھا — "تم سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ بُرا نہیں مانو گی۔ بچپن کے یہ 'commitment' کچھ زیادہ اہم نہیں ہوتے۔ — تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو اور خوبصورت تو لوگوں نے تمہیں ہمیشہ ہی کہا۔ تمہیں وہاں کوئی اچھا سا لڑکا مل جائے گا۔ ہو سکتا ہے تمہارے ابو نے کسی کو پسند بھی کر رکھا ہو۔"

وہ گُنگ ہو گئی۔ ایک ہفتے تک اس نے نہ کچھ کھایا نہ کسی سے بات کی۔ پھر وہ چوٹ کھائی ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ بیٹھی۔ سوگ کا بادہ اس نے ایک جھٹکے سے اتار پھینکا۔ غصہ اتارنے کے لیے صرف کتابیں تھیں اور اپنا وجود۔ وہ ہر وقت کتابوں میں غرق رہتی تھی یا شام ڈھلے تک لیبورٹری میں مائکرو اسکوپ پر جھکی رہتی۔ فائنل امتحان قریب تھے۔ اس نے بی۔ ایس۔ سی میں ٹاپ کیا اور وظیفہ لیکر ایم۔ ایس۔ سی پر ٹوٹ پڑی۔ اتنے گولڈ میڈل اکٹھے کیے کہ ان کا ہار بناتی تو مزے میں بن جاتا جیسے اماں کے پاس ایک ہار تھا جس میں اشرفیاں پروئی ہوئی تھیں۔ مائکرو اسکوپ پر جھکے جھکے اس کی نظر کمزور ہو گئی اور چشمہ لگانے لگی۔ لڑکے اس کے موٹے چشمے اور سونے کے تمغوں کی تعداد سے گھبرا کر دور بھاگ جاتے۔ ایسی مردوں کو بہت ذہین عورتوں کی عادت نہیں پڑی تھی انہیں مزید دور بھگانے کے لیے اس نے پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ ڈیپارٹمنٹ میں ریسرچ اسکیم آئی تو پہلے وہ ریسرچ

آفیسر بنی اور پھر ہوتے ہوتے اس نے اسکیم کے ڈائرکٹر کی جگہ سنبھال لی۔

اور آج جب بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں اور اماں ابا اس کے بیاہ کی آرزو لئے مر کھپ چکے تھے تو جانے کہاں سے یہ بھولا بھٹکا جگنو اس کے کمرے میں در آیا تھا اور چمک چمک کر اسے چڑانے پر مُصر تھا۔

وہ دونوں اتفاق تھے۔ محض اتفاق۔ یہ سارے اچھے بُرے شگون محض اتفاقات کی دین ہیں۔ پھر اب اس کے خط کی آرزو کرنے سے کیا فائدہ؟ جگنو تُو جا۔ تیرا آنا بیکار ہے۔ مگر پچیس برس پہلے کی وہ شوخ و شنگ لڑکی پھر دل کی کھڑکیاں کھول کر جھانکنے لگی۔ ذرا دیکھو تو کیا جھوٹ ہے اور کیا سچ۔ ڈاکٹر شمیمہ اسلم اُسے ڈانٹتی رہیں مگر اس لڑکی نے کہا۔ جگنو رے جگنو میرے ہرجائی محبوب کا کچھ پتہ ہے تجھے؟ کہاں ہے وہ؟ کبھی مجھے یاد کرتا ہے؟ اس کی خیر خبر لے آ تو یہ سارا علم اٹھا کے پھینک دوں۔

خیر خبر؟ اس کی خیر خبر منگانے کی کیا ضرورت ہے لڑکی؟ وہ کراچی کے ایک وسیع و عریض بنگلے کے خوبصورت لان میں بیٹھا چائے پی رہا ہوگا۔ آس پاس بیوی بچے موجود ہوں گے۔ کسی بیٹی کے بیاہ کی بات ہو رہی ہوگی یا کسی بیٹے کے کیریئر کی یا صرف قہقہے لگ رہے ہوں گے۔ وہ کچھ بھی کر رہا ہو کہیں بھی رہ رہا ہو۔ ان کا لہجہ تلخ ہو اٹھا اور آواز تیز تر — تمہیں اب اس سے مطلب —!!

لڑکی نے انگلیوں کی پوروں سے آنسو پونچھے اور ان کے دل کے نہاں خانوں میں دبک کر ساری کھڑکیاں بند کر لیں۔

جگنو کچھ دیر چمکتا رہا۔ پھر کھڑکی سے باہر نکل گیا۔

ایک تھکی ہوئی عورت

حسبِ معمول اس رات بھی وسندھرا نے اپنی سہاگ رات کا تصور کیا اور راجے کی طرف کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کانچ کی سرخ چوڑیوں کے جگر جگر کرتے ننھے ننھے ٹکڑے تصور کی آنکھوں کے سامنے ناچ اٹھے جیسے ستارے ٹوٹ کر شرارے چھوڑ رہے ہوں۔ اس نے نیند اسی آنکھوں کو ایک مرتبہ پھر کھول کر اس اجنبی کو چھوا جو اس کے قریب سو رہا تھا اور بڑے دکھ سے سوچا کہ کیا یہی شخص تھا جو اس انوکھی، اچھوتی، کبھی دوبارہ واپس نہ آنے والی رات کو اس کے ساتھ تھا اور جس کو اس نے انتہائی محبت اور دل کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ اپنا جسم سپرد کیا تھا۔

وسندھرا کا مطلب ہوتا ہے دھرتی ––– اکثر اس کے کانوں میں سنجیدہ، بوڑھے سفید پوش برہمن ماسٹر جی کی آواز گونج جاتی۔ جب وہ کوئی دس برس کی تھی تو اس کی دوست مدھو نے بتایا تھا کہ اس کا نام کا مطلب ہے شہد۔ تب ہی اس کو بھی سوجھا تھا کہ ماسٹر جی سے اپنے نام کے معنی پوچھے لیکن معنی سن کر وہ کچھ اُداس سی ہو گئی۔ دھرتی تو بہت دکھ جھیلتی ہے۔ نہ جانے کتنی بار اس کی چھاتی پھٹتی ہے، نہ جانے کتنے قدم اس کو روندتے ہیں اور اس کے یہ کہنے پر پاپا بولے تھے۔ "بھئی بڑی قنوطی مزاج ہے یہ لڑکی۔ کچھ شاعر واعر بنے گی کیا؟" وسندھرا شاعر تو نہیں بنی لیکن اس کے مزاج میں جو اُداسی رچی تھی وہ ہمیشہ یوں ہی رہی۔ راجے سے بیاہ ہو جانے کے بعد بھی اکثر وہ

سوچتی کہ میں جو یوں دکھی رہتی ہوں تو اس میں لوگوں کا ہاتھ ہے، حالات کا ہاتھ ہے یا صرف میرے اپنے مزاج کا۔ اس کی زندگی میں جب بھی کوئی سکھ کا لمحہ آتا (اور سکھ کے لمحے چند برس پہلے تو اکثر آتے رہتے تھے) تو وہ اسے پی جانا چاہتی۔ ان لمحوں میں جو صورتیں سامنے ہوتیں، انہیں آنکھوں میں اُتار لینا چاہتی۔ اس کا ذہن ایک ایک گھڑی کا رس نچوڑ لینا چاہتا لیکن کوئی کان میں پکارتا رہتا "یہ سب بیت جائے گا۔ یہ سب بیت جائے گا اور تب تو سوچے گی کہ کیسا تھا وہ وقت۔ کہاں گئے وہ لمحے۔ کیا کبھی وہ وقت آیا بھی تھا؟ اور وہ کچھ ایسا گھبراتی کہ سکھ کے لمحے ہاتھ سے پھسل پھسل پڑتے۔ چکنی مچھلیوں کی طرح یہ لمحے ہاتھ سے پھسلتے اور غڑاپ سے وقت کے دھارے میں غائب ہو جاتے۔ پھر ان کا پتہ نہ ملتا اور جب تصور کی آنکھیں انہیں سامنے لانا چاہتیں تو ان کے آگے دھند کی دبیز چادر پھیل جاتی۔ دکھتا سب کچھ مگر کچھ ایسے جیسے دکھائی دیکر بھی نہ دکھائی دے رہا ہو۔

دھند کی اسی چادر کے پیچھے سے وہ اکثر اجے کو دیکھا کرتی تھی۔

اجے اس کے بھائی بمل کا دوست تھا اور اکثر شام کو ان کے یہاں آ جاتا۔ یہ وہ وقت تھا جب وسندھرا نے کالج جانا شروع کیا ہی تھا۔ ماں تربیت کے لئے اسے زبردستی کچن میں بھیجتیں۔ بمل کے دوست بیٹھے ہوتے تو بس ہر گھڑی چائے اور ناشتہ۔ وسندھرا چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے اجے کو دیکھتی تو اس کا دل چاہتا کہ وقت تھم جائے۔ آنکھیں اس موہنی مورت کو اُتار لیں اور وہ وہاں ہمیشہ کے لئے یوں جم جائے جیسے چٹانوں میں [illegible] Fo وسندھرا نے بی۔اے میں انیتھروپالوجی (Anthropology) کے ساتھ انگریزی ادب بھی لیا تھا لیکن اجے کو دیکھ کر ادب سو جاتا اور انیتھروپالوجی غالب آ جاتی۔ اسے بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہزاروں سال سے اجے کا نام اور اس کی تصویر دل میں اُتر چکے ہیں اور اس احساس کے وقت اسے اجے جیسا وجیہہ اور زندگی سے بھرپور لڑکا بس FOSSIL ہی معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے کب، کیوں اور کیسے ایسا ہوا کہ اجے نے اس کے جذبے کو پہچان لیا۔ جس وقت اس نے پہلی مرتبہ اظہار محبت کیا تھا وہ منہ بھی وسندھرا کو وقت کی چادر کے پیچھے سے دھندلا دھندلا سا دکھائی

دیتا تھا۔ اس وقت وہ مسرت کی زیادتی سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اُجے کی آواز اسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"تو سمجھتی ہے دسُو کہ محبت صرف لٹریچر والے کر سکتے ہیں۔ کیا بابو کیمسٹری پڑھنے والوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔" اور اس نے اپنا ہاتھ وسندھرا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس وقت کسی مضبوط درخت کے تناور تنے جیسے اس ہاتھ میں لرزش تھی اور وسندھرا کا پورا وجود کسی نازک بیل کی طرح کبھی دائیں جھول رہا تھا اور کبھی بائیں۔ اُس وقت بہت خوف زدہ ہو کر اس نے سوچا کہ یہ لمحہ بیت جائے گا۔ وہ اس 'آج' کو اس 'ابھی' کو ذہن میں محفوظ کرے ورنہ کل — یا کل کیوں بس چند مزید لمحوں کے بعد یہ لمحہ گذر چکا ہو گا۔ ٹھہر جا۔ اے وقت ٹھہر جا۔ اور اس نے کانپ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

شادی کی تمام رسموں اور ہنگاموں میں اس کے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ اُجے اس کا ہے۔ وہ اس کو چھو سکے گی، جی بھر کر دیکھ سکے گی۔ اس کی بیوی کہلائے گی۔ یہ ٹھوس حقیقت ہاتھ سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر بھاگے گی نہیں مگر مسرت کے لمحات پھر بھی اس سے بھاگتے رہے۔ جل پریوں کی طرح ناچتے، پاس آتے مگر رُکتے نہیں۔ بہتے ہوئے دور چلے جاتے اور ایسی ہی ایک جل پری اس کی سہاگ رات بھی تھی۔ چوڑیوں سے سہاگ رات کا تصور ہونا فطری سی بات ہے مگر وسندھرا کا تصور چوڑیوں کے ننھے ننھے ٹکڑوں سے وابستہ تھا۔ اُجے کی پہلی دست درازی میں ہی چار چھ چوڑیاں اکٹھی کھن کھن کرتی نیچے آ رہیں اور وسندھرا بے اختیار مسکرا دی۔ یہ اس قدر شریف، اس قدر کم گو، اس قدر گہرا اُجے بھی کیسا جانور جیسا بن گیا ہے لیکن اس وقت اُسے وہ جانور ہی بہت پیارا لگا۔ اس کے گھنے بالوں میں منہ چھپاتا ہوا اُجے، اس کے لبوں کا بوسہ لیتا ہوا اُجے، اس کے کانوں میں خوبصورت لیکن بے معنی باتیں کرتا ہوا اُجے اور پھر یہ جانور اُجے۔ اس نے ساری تصویریں آنکھیں بند کر کے آنکھوں میں اُتار لیں۔ سارے لمحوں کا رس نچوڑ کر دل کے پیالے میں بھر لیا۔ صبح منہ اندھیرے اٹھ کر اس نے ان چوڑیوں کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا۔ ہتھیلی پر رکھ کر دیر تک انہیں دیکھا پھر چوم کر

وینٹی کیس میں رکھی انگوٹھی کی ڈبیہ میں مقید کر لیا۔ لمحے پھر بھی بھاگ گئے۔

ان کا سب سے پہلا جھگڑا اسی بات پر ہوا تھا اور آخری بھی اسی بات پر۔ نہ جانے کیوں سال پورا ہوتے ہی وسندھرا کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اجے کی چاہت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا ہے۔ وہ پہلے بھی بہت سنجیدہ تھا، جذباتی کبھی نہیں تھا لیکن ایسا بھی کیا۔ وسندھرا کو لگتا جیسے شاخ پر پھول تو موجود ہے لیکن دھوپ سے اس کا رنگ اڑنے لگا ہے اور خوشبو بکھر چکی ہے، پھیکا پھیکا سا بے رنگ ویلوٹ پھول۔ اسے اجے سے واحد شکایت یہی تھی کہ اس کے پیار میں گرم جوشی نہیں رہی ہے۔ وہ جھگڑتی، روتی، طعنے دیتی اور وہ خاموشی سے سنتا رہتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ جملہ بولتا بھی مگر بے حد مختصر اور چبھتا ہوا پھر بُت بن کر یا تو اخبار میں غرق ہو جاتا یا پھر کیمسٹری کی کسی موٹی سی کتاب میں اور وسندھرا حیران سی ہو کر سوچتی کہ اس سے غلطی کہاں ہوتی ہے۔ اجے کہتا ہے کہ میں تو تجھے اتنا ہی پیار کرتا ہوں جتنا پہلے کرتا تھا اگر تجھے محسوس نہیں ہوتا تو یہ تیری کم عقلی ہے۔ ان الفاظ میں سچائی ہے تو پھر یہ محض الفاظ کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ روح سے خالی اور بے جان الفاظ جیسے کسی کا دل رکھنے کو کہہ دیے گئے ہوں یا ہر بات کے جواب میں احمق، خبطی، کم عقل کہلائے جاتے رہنے سے اس کی عقل واقعی خبط ہو گئی ہے اور اسے اجے کی محبت کا احساس نہیں ہوتا یا اس کی عقل اس وقت بھی خبط تھی جب اس نے اس زمین کی پوجا کی تھی جہاں اجے چلا تھا۔

بچوں کے آنے کے بعد سے جیسے اس کے اور اجے کے درمیان ایک واضح دراڑ آ گئی تھی۔ وہ آفس سے آتا تو دونوں بچوں کو تھام لیتا۔ ٹور پر جاتا تو ننھی بچی کے گالوں پر بوسہ دیتا۔ پاس کھڑی وسندھرا کے حصے میں آتی ایک نگاہِ غلط انداز۔ اجے کا کہنا تھا کہ اسی نگاہ میں گہری محبت ہوتی ہے اور وسندھرا کو لگتا کہ بس وہ ایسی ہی نظر ہوتی ہے جیسی لوگ آس پاس کی چیزوں پر صرف اس لئے ڈال لیتے ہیں کہ وہ آس پاس موجود ہوتی ہیں۔ اسے لگتا جیسے ایک بے نام سی اداسی اس کے دل میں در آئی ہے، دبے پاؤں، بغیر دستک دیے، بغیر اجازت لئے۔ شام اداس ہوتی ہے، دھوپ اداس ہوتی ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں دل میں

کوئی چھپا ہوا درد جگاتی ہے۔ اُسے لگتا وہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتی ہوئی ایک ننھی سی بچی ہے جسے کونے میں چھپتے وقت کسی نے 'ہُو' کر کے ڈرا دیا ہے۔ اس کا جی چاہتا اَجے کی چھاتی میں منہ چھپا لے اور کہے کہ اسے ڈر لگ رہا ہے اور اس کا جی اداس ہے لیکن پھر وہ سوچتی کہ کہیں اَجے نے 'احمق ہو تم' کہہ کر اُس نے منہ چھپا لیا تو دھرتی کی چھاتی دو ٹکڑے ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے شادی کے بعد سب ہی مرد ایسے ہو جاتے ہوں۔ وہ کس سے پوچھے کہ شادی شدہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ اَجے بہت شریف ہے کبھی اونچی آواز سے نہیں بولتا، کوئی ایسی تکلیف نہیں پہنچاتا جس پر انگلی رکھی جا سکے۔ اب اگر کسی سے وسندھرا کہے کہ وہ چاہتی ہے کہ اَجے اسے پکارے تو اس کی آواز میں وہی شہد ہو جو اظہارِ محبت کے پہلے کنوارے بولوں میں تھا، وہ اس کی طرف دیکھے تو آنکھوں میں دیپ جل اُٹھیں، وقت بے وقت وہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دے، جسم کی طلب نہ ہو تو بھی اُسے پیار کرے، تو پتہ نہیں فیصلہ وسندھرا کے حق میں ہوگا یا نہیں۔ اَجے سے وہ یہ سب کہتی ہے تو جواب ملتا ہے تم فلم زدہ ہو۔ میں کیا فلمی گیت گاؤں تب ہی تم سمجھو گی کہ تم سے پیار کرتا ہوں۔ وسندھرا اُس سے ہو جاتی ہے۔ دل کے اندر کچھ ٹوٹ سا جاتا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے تو گڈو کے رونے کی آواز آتی ہے اور وہ دوسری طرف کروٹ بدل کر پالنا ہلانے لگتی ہے۔ گڈو سو جاتا ہے تو وہ اَجے کی طرف مڑتی ہے۔ اَجے حسبِ معمول دوسری طرف رُخ کر کے سو چکا ہوتا ہے۔ ایک بازو آنکھوں پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ وسندھرا کو شدید جھنجھلاہٹ ہوتی ہے مگر آنسو پیتی وہ اَجے کی پشت سے چمٹ کر سونے کی کوشش کرتی ہے۔ شادی کے بعد سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے کہ جب تک وہ اَجے کے گرد اپنے بازو نہ ڈال دے اسے نیند نہیں آتی مگر کیسا پتھر ہے یہ شخص۔ اُسے چھوئے بغیر ہی سو جاتا ہے یہ بھی نہیں کہتا کہ وسندھرا تو کب آرہی ہے ادھر جلدی سے آجا۔ تجھے تو نیند آچکی ہے۔ ایسا ہو تو ساری شکایت دور نہ ہو جائے۔ دل کیسا پگھل اُٹھے۔

مگر وہ کس سے پوچھے کہ کیسے ہوتے ہیں شادی شدہ مرد؟ اس کی ایک ہی سہیلی

ہے مدھو جو یہاں ہے مگر اُسے شوہر کی پرواہ نہیں - اپنے ریسرچ پیپرز زیادہ عزیز ہیں - رہی ماں تو وہ آج پانچ برس ہو جانے پر بھی بھگوان کی آرتی اُتارتے وقت ان کا شکر ضرور کرتی ہے کہ انھوں نے اس کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو کیسا اچھا دولہا دیا ہے - نیک، کماؤ، سوشیل - اگر وسندھرا ماں سے کہے کہ ماں میرے دل کو چین نہیں ہے تو ماں صرف یہی سوچیں گی کہ ان کی پیاری بیٹی کا دماغ چل گیا ہے -

اس سے تو اچھا تھا کہ اس کی شادی کہیں اور ہوتی - اجے کے دل میں سدا ہی اس کی چاہت برقرار رہتی - تب وہ بکھرے بال والی، ڈھلکے آنچل والی، بچے کو دودھ پلاتی وسندھرا کو نہ دیکھ پاتا - اس کے دل میں سدا اس لڑکی کی موہنی مورت رہتی جس کے سلونے چہرے پر کشش تھی اور آنکھوں میں چمک - تب شاید وہ اپنی بیاہتا بیوی کی طرف سے کروٹ بدل کر سوتا تو اس کے دل میں وسندھرا کی شبیہہ بجلی کی طرح کوندتی اور دل کو منور کر جاتی - ایسا ہوتا تب ہی اچھا تھا -

بھاری دل کے ساتھ وہ ایک بار پھر اپنی سہاگ رات کو یاد کرتی ہے - ہاتھ بڑھا کر ان لمحوں کو پکڑ لینا چاہتی ہے جو پانچ سال پہلے ایک مرتبہ اس کی زندگی میں آئے تھے مگر وہ تو چمکیلی مچھلیوں کی طرح آنکھوں کے آگے ناچتے ہیں اور غڑاپ سے وقت کے دھارے میں بہتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں - آنسو پیتے ہوئے وہ کروٹ بدلتی ہے اور اجے کی پشت سے چمٹ کر سو جاتی ہے -

پرائے چہرے

سارے گھر میں ایک بار پھر وہی سناٹا چھا گیا تھا جو اکثر ایسے موقعوں پر چھا جاتا رہا تھا۔ بھابھی خاموشی سے سر جھکائے چاول چُن رہی تھیں۔ امّاں خلا میں کچھ دیکھتی دانتوں میں پھنسی چھالیہ کا ٹکڑا زبان سے کریدنے میں مصروف تھیں، باہر بیٹھک میں بابوجی نے اخبار کے پیچھے سر چھپا رکھا تھا بھیا گھر میں تھے ہی نہیں۔ وہ عموماً راہِ فرار پسند کیا کرتے تھے۔ سنیتا دیدی مشین پر جھکی بھیا کی بچی کا فراک تیار کر رہی تھیں۔ مشین کی آواز کی یکسانیت سر پر قطرہ قطرہ ٹپکتے پانی کی طرح اعصاب میں ایک عجیب سا تکلیف دہ احساس پیدا کر رہی تھی۔ گھر کی اس سخت اونگھتی اُداس فضا میں ارُون کا دم جیسے گھُٹا جا رہا تھا۔ ویسے بھی یہاں آ کر اس کا دم بلاوجہ بھی گھٹتا رہتا تھا۔ انتہائی بے زاری کے عالم میں اس نے کچے آنگن سے ایک کنکری اٹھائی اور سامنے درخت پر چڑھتی گلہری پر پھینکی۔

"حرامزادے"۔۔۔ اماں نے اپنا محبوب لفظ دوہرایا۔

"کون ماں ؟" ارون چونک پڑا۔ پل بھر کو وہ بھول گیا کہ اماں اس وقت کسے گالی دے سکتی ہیں۔

ارے وہی اور کون۔ ناشتہ کھانا ٹھونس ٹھانس کر چلے گئے اور جواب تک نہیں دیا۔ آج دوبارہ آدمی بھیجا تو کہتے ہیں کہ لڑکی پسند نہیں ہے۔ ان کی لڑکیوں کی جوانی مٹی میں ملے — ارے ورون کی بہو! چولہا سلگایا یا دن بھر چاول ہی چُنتی رہوگی۔ انھوں نے ترچھے سے

پان کی پیک پھینکی۔ ارون بجلی کی تیزی سے ہٹ گیا ورنہ اس کا کُرتا گلنار ہو جاتا۔
کچھ آگے تیجے تو دیکھا کر دماں۔

ارے تو کیوں نہیں دیکھتا۔ آگا پیچھا۔ سامنے دھنس کے بیٹھا ہوا ہے یہ بڑا جاٹ کا جاٹ۔ ارون کو شدید کوفت کا احساس ہوا۔ اماں کی سمجھ میں اس کی عمر کبھی نہیں آئے گی۔ جو منہہ میں آتا ہے بک جاتی ہیں۔ وہ ۲۸ واں پار کر چکا۔ شادی بیاہ کی عمر آئی بلکہ باپ بننے کی۔

اماں! ارون کہہ رہا تھا تلی ہوئی مچھلی کھانے کے لئے۔ پرتیبھا نے دھیرے سے آکر ماں سے کہا۔ ارون نے نظریں اٹھائیں تو پرتیبھا کی صورت دیکھ کر اس کا جی جل ہی تو گیا۔ تیل سے چپڑے ہوئے بال، شکل پر خاک اڑتی ہوئی۔ پیروں میں ہوائی چپل، ایک چپل کا اسٹریپ سیفٹی پن سے اٹکایا ہوا تھا۔ مریل سے رنگ کی ساڑی جو نئی ہونے کے باوجود پرانی لگ رہی تھی۔ کتنی بار کہا کہ چہرے پر کچھ رنگ و روغن لیا کرو اور رنگ ذرا ڈھنگ کے پہنو کہ کچھ تو صورت نکلے لیکن اُس کا حلیہ ہمیشہ یہی رہا کرتا تھا۔ لیپ پوت کر تو مٹی کے مکان کی صورت بدل جاتی ہے تو یہ تو لڑکی ٹھہری۔ کیا ہوا جو عمر ذرا زیادہ ہو گئی تھی۔ اماں ہمیشہ روپیوں کا رونا روتی رہتی تھیں۔ جو آتا ہے جھاڑو پھیرا اسی لئے لوٹ جاتا ہے کہ اس گھر کی صورت اُسے روپئے اگلنے والی نہیں نظر آتی نہ ڈائننگ ٹیبل، نہ صوفہ، نہ فریج، نہ قالین۔ بے رنگ مکان، اکھڑا پلاسٹر۔ وہ سب تو خیر تھا ہی لیکن پرتیبھا کی اکھڑے پلاسٹر والے مکان جیسی بے رونق صورت دیکھ کر بھی لوگ بھاگ سکتے ہیں یہ اماں کی سمجھ میں آتا تھا نہ بابوجی کی۔

"مچھلی کھانے کو کہہ رہا تھا تو لے آئے جاکر۔" وہ پلو کھول کر پیسے نکالنے لگیں۔

یہاں لانے والا کون ہے۔ تمہارے بابوجی دو وقت کھانا نہ کھائیں وہ گوارا ہے لیکن بازار جانا گوارا نہیں۔ تھیلا اٹھاتے عزت گھٹتی ہے اور وہ ڈھنیک کا ڈھینگ ارون۔ اس کا حال یہ ہے کہ بازار جائے گا تو لیکن دوکان دار نے سڑی چیز دیدی تو سڑی لے آئے گا اور اچھی دیدی تو اچھی۔ اماں کو تو بہانہ ملنا چاہیئے ریس ٹیپ ریکارڈر چالو ہو جاتا ہے۔ ارون جھنجلا گیا۔

لے آؤں گا اماں - مگر پیسے رکھو - ہیں میرے پاس - میں نے آج ہی تھوڑا ہی کھایا تھا مچھلی کھانے کو - پھر وہ جلدی سے جان بچا کر بھاگا - کون اماں کا مزید لکچر سنے - وہ اب ورون سے درون کی بہو کی طرف آ گئی تھیں اور قصیدہ جاری تھا -

راستے میں ببیلک کے بچے نے پیشاب کر رکھا تھا - اس سے ذرا ہٹ کر بھابی نے چننے ہوئے چاولوں کی تھالی رکھ دی تھی - سنیتا دیدی نے فراک سمیٹتے سمیٹتے سر پر ہاتھ پھیرا - ان کے کھچڑی بالوں کی لٹ پیشانی پر جھک آئی - ارون کے دل میں ہوک سی اٹھی - سنیتا دیدی اس سے سات آٹھ برس بڑی تھیں - بڑی تو پرتیبھا بھی تھی لیکن صرف سال بھر اور سبکی ڈانٹ سننے کے باوجود ارون نے اسے کبھی دیدی نہیں کہا - بال کھینچ کر لڑتے لڑتے سارا بچپن بیت گیا تھا اور اب ہر وقت بجتا بجتی - پرتیبھا تھی بھی بڑی کٹ حجتی -

دراصل آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا - سولہ سترہ برس کی عمر میں جب لڑکی کے اندر چھپی ہوئی عورت جاگتی ہے تو اماں کے قبیل کی عورتیں ہی اسے پتھر لیکر سنگسار کر دیتی ہیں -

یہ ہر وقت آئینے میں منہہ کیوں تاکا جا رہا ہے ؟

خبردار جو لپ اسٹک چھوئی - شریف گھرانے کی لڑکی ہے یا طوائف ؟ ساری عمر پڑی ہے - دولہے کے گھر کرنا سنگار پٹار -

اری کلموہی ! اتنی زور سے چلا کر کیوں ہنستی ہے -

نا — کہیں نہیں جانا ہے کیمپ ویمپ - یہ اسکول والے مرے ایسے ہی شوشے چھوڑتے رہتے ہیں - کنواری لڑکیاں گھر والوں کے بغیر کہیں نہیں جاتیں -

پرتیبھا کے سارے شوق اماں کے منہہ سے جھڑتے پتھروں نے سنگسار کر دیئے تھے اور وہ خود بھی پتھر ہو گئی تھی - گریجویٹ ہونے کے باوجود دبو جھینپو - غیر ضروری شرافت اور حیا اس کے اوپر کیچڑ بن کر چپک گئی تھی - کسی کے سامنے جاتی تو چہرہ سرخ ہو جاتا - منہہ سے بات نہ نکلتی - وہ دُرگا بابو رشتہ لائے تھے - ان کا کہنا تھا لڑکے کو جہیز نہیں چاہیے بس لڑکی ذرا اسمارٹ ہو - لڑکے والوں کے آنے کی خبر بھی چار دن پہلے مل گئی تھی - ارون نے کہا دیدی

پرتیبھا کے لئے ایک نیا بلاؤز سلوا دیجئے ذرا نئی تراش کا اور سن ری ۔ وہ پرتیبھا سے مخاطب ہوا۔ کوئی لپ اسٹک وغیرہ ہے تیرے پاس یا لا دوں ؟ اماں بیچ میں جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں ۔ کیوں رے بہن کو بگاڑے گا کیا اُن لوگوں کے سامنے ؟ اور ارون غصے اور شرم دونوں سے لال ہو اٹھا۔

پرتیبھا سامنے گئی تو پورے وقت منہ نیچا کئے ساڑی کا پلو مروڑتی رہی ۔ لڑکے نے کچھ پوچھا تو کانوں تک چہرہ سرخ ہو اٹھا ۔ آنکھیں ہتھیلیوں پر گڑ گئیں ۔ ہو گئی چھٹی ۔ اب اماں صبح سے بیٹھی لڑکے کی بہنوں کی جوانی مٹی میں ملا رہی تھیں ۔ دیدی کی عمر تو نکل گئی گھر کا خرچہ ڈھوتے اور اپنے جہیز کے پیسے جوڑتے ۔ جس رفتار سے پیسے جڑے ، عمر اس سے دوگنی رفتار سے آگے بھاگ گئی ۔ اب وہ وہاں تھیں جہاں دُلہن بننے کی ، شادی بیاہ کی بات مذاق معلوم ہوتی ہے ۔ اب سب لوگ پرتیبھا کا دُولہا ڈھونڈ رہے تھے ۔ جہیز اس کے لئے اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا ۔ ورون بھیا نے کچھ پیسے جوڑے تھے ۔ بابوجی کا پراویڈنٹ فنڈ مل گیا تھا ۔ دیدی نے بھی اعلان کر دیا تھا کہ اپنے سارے پیسے وہ پرتی کو دیدیں گی ۔

مچھلی خریدتے ہوئے ارون کے منہ میں کڑواہٹ گھلنے لگی ۔ بھابی مچھلی بہت اچھی پکاتی تھیں اس لئے وہ فرمائش کر بیٹھا مگر دھواں بھرے کچن میں بیٹھ کر کھانے سے سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے ۔ اور کوئی جگہ ہے ہی نہیں ۔ جگہ جگہ پوتڑے ، پیشاب ۔ یہ گھر بھی اور لوگوں کے گھروں جیسا کیوں نہیں ہو سکا ؟ اماں کو کبھی عقل کیوں نہیں آئی ۔ محبت تو خیر کرتی ہیں ماں ٹھہریں مگر ہر وقت بک بک ۔ چولہا چکی ، ورون بھیا اور ان کے بیوی بچوں کی ڈانٹ ڈپٹ ، سنیتا دیدی سے جھک جھک ۔ اچھا ہوا جو وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور دور دراز بمبئی میں جا کر نوکری ڈھونڈی ۔ اس نے مچھلیاں خرید کر ٹوکری میں بھریں ۔ ماں سے ، گھر سے دور بھاگ جانے کی خوشی اس میں ہمیشہ احساسِ گناہ پیدا کرتی تھی ۔ اس وقت بھی وہ دل ہی دل میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا ۔ اچھا اس بار طویل چھٹی لیکر آؤں گا تو پرتیبھا کے لئے خود لڑکا ڈھونڈوں گا ۔ بابوجی بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے رہتے ہیں ۔ ورون بھیا اپنے جیسے اُول جلول لوگ پکڑ لاتے ہیں ۔ بات کہیں بنتی نہیں ۔ بیچاری ماں ۔ بے چارے بابوجی ۔ مگر ایسا وہ ہر بار سوچتا

تھا۔ جب بھی یہاں آتا اور چاروں طرف مسائل کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں ہاتھ پیر مارتے لوگوں کو دیکھتا تو احساسِ جرم سے بھر اٹھتا تھا۔ نوکری کرتے یہ چوتھا سال تھا لیکن ابھی تک وہ ان لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ یہ سب جو اس کے 'اپنے' تھے اور اکیلے اپنی اپنی جگہ زندگی سے نبرد آزما تھے۔ وہ ان کا ہاتھ بٹا سکتا تھا۔ شاید وہ ان سب سے زیادہ خوش قسمت تھا اس لئے کہ اس نے ان سے، ان کے مسائل سے فرار پانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ پرتیبھا اور دیدی دونوں کے لئے اپنے طور پر لڑکا ڈھونڈنے کی بات اس نے کئی بار سوچی لیکن بمبئی میں اس کا ایک کمرے اور تنھے سے کچن والا جو گھونسلا تھا' وہاں پہونچتے ہی وہ جیسے ایک ککون (cacoon) میں بند ہو جاتا تھا۔ وہاں کی دنیا بڑی حسین تھی اور یہاں کے بدصورت مسائل میں الجھنے کے لئے اپنا خون جلانے کی ضرورت تھی۔ یہاں کا اُبلتا لہو وہاں پہونچ کر جھٹ ٹھنڈا ہو جاتا۔ ایک موہوم سے درد کا احساس' ایک تکلیف دہ لگاؤ، ایک بے نام سی جھنجھلاہٹ' باقی رہ جاتے تو بس یہی۔

وہ گھر کی دہلیز پر ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا۔ باہر بلب نہیں جل رہا تھا۔ اماں ہمیشہ کہتی تھیں کہ اسٹریٹ لائٹ کافی ہے۔ دروازے پہ بتی جلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے جھنجھلاہٹ میں مچھلیوں کی ٹوکری ذرا زور سے پٹکی تو اماں نے دور ہی سے للکارا "اسی لئے تو کہہ رہی تھی کہ میں دیدوں پیسے۔ چیز خرید کے لاتا ہے تو تیہا دکھانے لگتا ہے۔"

ارون شرمندگی کے شدید احساس سے بھر اٹھا۔ اس لئے نہیں کہ اس نے ٹوکری پٹکی تھی بلکہ اس لئے کہ ماں اس کے بارے میں اتنی گھٹیا بات سوچ سکتی ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں تھا۔ زندگی نے قطرہ قطرہ کرکے ان میں اتنی کڑواہٹ بھری تھی کہ وہ سراپا زہر بن گئی تھیں۔ ویسے بھی جب سے ارون نے مکان کی مرمت کے لئے پیسے دینے کو منع کیا تھا' اماں اس سے کچھ بھی نہیں لینا چاہتی تھیں اور ایسے ہی گھٹیا طعنے دیتی رہتی تھیں۔

نوکری کے پہلے سال ارون نے خوب سب کو تحفے تحائف دیے۔ بھیا بیچارے تو کسی کو کچھ لینے دینے سے پہلے ہی بندھ گئے تھے۔ کتنے دن بابوجی نے ان کا بھی کنبہ سنبھالا

تھا۔ اروُن نے ماں کے لئے ساڑیاں خریدیں، بابوجی اور پرتیبھا کے لئے چھوٹی موٹی بہت ساری چیزیں۔ مگر پھر اس نے بچت کرنی شروع کی۔ تین سال میں آٹھ نو ہزار روپے ہو گئے تھے۔ ان کے سہارے اس نے بہت سے خواب بُنے تھے۔ ایک وارڈ روب، ایک ڈائننگ ٹیبل، ایک لانبے شیشے والی ڈریسنگ ٹیبل، کچھ سجاوٹ کا سامان۔ سب مِلا جُلا کر منہ سے بولتا ہوا سا فلیٹ اور فلیٹ میں اٹھلاتی، ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگاتی، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی سنگار کرتی ارچنا، دبلی پتلی، سانولی سلونی، لانبی چوٹی والی ارچنا جو پڑوسن کی بیٹی تھی اور جس کی ساری کا لہراتا پلو آس پاس رنگ بکھیرتا رہتا تھا۔ کبھی سرخ، کبھی زرد، کبھی سبز اور کبھی دھنک کے ساتوں رنگ اکٹھے۔ وہ ماں اور بابوجی، بھیا اور بھابی اور دیدی کی طرح زندگی کے جوئے میں بیل نہیں بننا چاہتا تھا۔ اسی لئے جب ماں نے اس سے یہ کہتے ہوئے مکان کی مرمت کے لئے روپے مانگے کہ اروُن، جو کماتا ہے وہ اس کے بال بچوں میں لگ جاتا ہے اور بابوجی کا پراویڈنٹ فنڈ پرتیبھا کی شادی کے لئے رکھ دیا گیا ہے تو اروُن صاف مکر گیا۔ ماں کا دل توڑتے ہوئے گویا اس کا دل کئی بار دُکھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ ماں کی بیشتر زندگی اس ٹوٹے پھوٹے کائی لگے مکان میں گزر چکی تھی، جو بچی تھی وہ بھی گزر ہی جائے گی لیکن وہ خود ——؟ وہ محنت سے کمائے اور دانت سے پکڑ پکڑ جمع کئے ہوئے یہ چند سکے اماں کے شوق پر کیوں خرچ کرے۔ اسے کچھ غصہ بھی آیا تھا۔ اماں آخر سمجھتی کیوں نہیں۔ اپنی جیسے تیسے گزار دی۔ اب بچوں کو تو چین سے جینے دیں۔ اور چین سے جی بھی کون رہا ہے اروُن بھیا؟ جو وقت سے پہلے جوئے میں جوت دیے گئے؟ تیس ۳۰ سالہ بھابی جو چالیس ۴۰ کی نظر آتی ہیں؟ جلے ارمانوں کی راکھ چہرے پر لگائے سنیتا دیدی اور پرتیبھا؟ نہیں نہیں۔ وہ اس ٹوٹی ہوئی ناؤ کو چھوڑ کر بھاگ چکا ہے اور اب اس کا ساجھے دار نہیں بنے گا۔ کبھی کبھی ضمیر منہ بھرائی مانگتا تو وہ دل ہی دل میں عہد کرتا۔ اچھا اپنے سارے سپنے پورے ہو جائیں تب اماں کو ضرور کچھ دوں گا۔ ماں پیاری ماں۔

باورچی خانے سے دھوئیں کے ساتھ ساتھ بھابی کی پکائی ہوئی مچھلی کی خوشبو

آ رہی تھی اس نے ارچنا کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ " چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پرسوں لوٹ رہا ہوں۔ اس بار بھی اماں کو تمہارے متعلق نہیں بتا سکا۔ ہمت نہیں ہوئی۔ فکر نہ کرنا۔ اگلی بار ضرور بتاؤں گا"

اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا۔ فلیٹ کیا، یہ دراصل ایک فلیٹ کا چھوٹا سا حصہ تھا ـــ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا مختصر باتھ روم کے ساتھ۔ سامنے پتلے سے کوریڈور کو گھیر کر شیشے سے کچن میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کمرے کے ایک کنارے صاف ستھرا اور آرام دہ بستر تھا اور دوسری طرف ایک کرسی اور رائٹنگ ٹیبل۔ کمرہ تازہ تازہ صاف کیا ہوا تھا۔ ٹیبل پر پھولوں کا گچھا تھا۔ اس بار بھی وہ حسب معمول ارچنا کو چابی دے گیا تھا۔ اس کی خوشبو بند کمرے میں سمائی ہوئی تھی۔ یہ ننھا سا کمرہ جنت تھا۔ وہ گنگناتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔ برش کرتے ہوئے اس کی نگاہ واش بیسن میں لگے آئینے پر پڑی ـــ وہ بابوجی سے کتنا ملتا ہوا ہے۔ اچانک وہ سارے چہرے پھر نظر کے سامنے تیرنے لگے۔ ارون کے دل میں ٹیس اٹھی۔ کسی نے اسے زور سے پھٹکارا۔ تمہیں کیا حق ہے اتنا خوش ہونے کا جبکہ ان سارے، اپنے پیارے لوگوں میں سے بھی کوئی بھی سکھی نہیں ہے۔ ارون کے شانے جھک گئے۔ گردن کچھ ڈھیلی پڑ گئی، وہ ڈوبا مگر ڈوب کر پھر ابھرا۔ جس مرض کا علاج نہ ہو اسے جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ میں اپنے محدود ذرائع سے صرف اپنے آپ کو خوش رکھ سکتا ہوں ان کے دکھوں کا مداوا میرے پاس نہیں ہے۔ وہ سب اپنی اپنی زندگی جی رہے ہیں۔ مجھے اپنی زندگی جینی ہے۔ اب اس کا میرے پاس کیا علاج ہے کہ میری قسمت میں مٹھی بھر مسرت زیادہ ہے اور ان کی قسمت میں مٹھی بھر غم زیادہ۔ برش ہاتھ میں لیے وہ پل بھر کو پتھر بنا کھڑا رہا۔ دنیا میں اتنے دکھ کیوں ہیں۔ ایسے دکھ جنہیں اگلتے بنے نہ نگلتے۔ اسے گلے میں کچھ پھنسنے کا احساس ہوا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ جانی پہچانی دستک۔ ارچنا آگئی تھی۔ ہنس مکھ ارچنا، محبت کرنے والی ارچنا۔

اردن اپنی ذات کے اندر سے باہر کو پلٹا۔ ارچنا اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ ایک بار پھر سب کو پیچھے چھوڑ کر اپنے خول میں بند ہو گیا تھا۔ ریشم کے کیڑے کی طرح۔ یہاں کسی کا گزر نہیں تھا۔ وہ سب باہر کی دنیا کے باسی تھے۔ ایک دم الگ۔

○

پائل

کچے ریشم کی کریم کلر چادر سے ڈھکا اور ڈنلپ کے گدوں سے آراستہ بیڈروم انتہائی آرام دہ تھا۔ پھر بھی نیند کنول کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اس نے برابر لگی شیلف سے ایک کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس میں بھی دل نہیں لگا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر پیتل کا بڑا سا منقش لیمپ آف کیا اور سرہانے لٹکا سوئچ دبا کر نائٹ بلب آن کر دیا۔ بڑی خواب آگیں سی نیلی روشنی کمرے میں بکھر گئی۔ اس نے آنکھیں موندلیں۔ ایک شیلف پر انتہائی نفیس گلدان میں زرد رنگ کے جو گلاب بھرے ہوئے تھے وہ اس مدھم روشنی جیسی ہی خواب آگیں خوشبو پھیلا رہے تھے۔ آنکھیں بند کرنے سے شاید اس کی ناک کی حس بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس خوشبو کا اتنا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

کمرے کے گھنی شکنوں والے پردے مہندی جیسے سبز رنگ کے تھے۔ قالین بھی گہرا سبز تھا۔ کمرے کی باقی سجاوٹ بھی کریم اور سبز رنگوں کے امتزاج سے کی گئی تھی۔ پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے وسیع و عریض لان نظر آ رہا تھا جو اس وقت اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نومبر کی خنکی میں تھوڑا برفیلا لمس تھا۔ کنول نے ایرانی بلی جیسا نرم گرم کمبل گردن تک کھینچ لیا اور ایک بار پھر آنکھیں موندلیں۔

اس مرتبہ اس کے کان جاگ اٹھے۔ کل صبح اس نے اپنے آنے کے کوئی چار گھنٹے بعد خاتونِ خانہ کی آواز سنی تھی۔ وہ انتہائی شستہ انگریزی میں اپنے بیٹے ڈیک سے کہہ

رہی تھیں " لڑکا واقعی وجیہہ ہے اور ذہین تو خیر ہے ہی مگر ذرا ناتراشیدہ دکھتا ہے۔ خیر ٹریننگ اور پوسٹنگ کے بعد پالش بھی ہو جائے گی "

" حاضر جواب اور ہنس مکھ بھی ہے ماں ۔ عثمانی انکل کبھی کوئی خراب چیز لیکر نہیں آتے "
دیپک نے ہنس کر جواب دیا تھا ۔

میں چاہتی ہوں وہ کم از کم ہفتہ بھر ضرور ٹھہر جائے ۔ الکا کو اسے اچھی طرح جاننے سمجھنے کا موقع ملنا بہت ضروری ہے ۔ پھر وہ ٹریننگ کے لئے چلا جائے گا ۔
میں روکنے کی کوشش کروں گا ۔

اسی وقت دیپک اندر داخل ہوا تھا اور ان لوگوں نے جھٹ موضوع گفتگو پلٹ دیا تھا ۔ کنول صبح سے حسیں ڈپریشن (Depression) میں مبتلا تھا اس میں بس ایک لمحے کو ذرا سی کمی آگئی تھی ۔ مسز باجپئی جیسی اسمارٹ جہاندیدہ اور تعلیم یافتہ خاتون نے اس کی ذہانت اور وجاہت کا اعتراف کیا تھا ۔ یہ بہت بڑی بات تھی ۔ شاید یوں بڑی نہ ہو لیکن کنول کو بہت بڑی معلوم ہوئی تھی ۔

لڑکا واقعی وجیہہ ہے ... لڑکا واقعی ... آوازیں چاروں طرف پھیل رہی تھیں ۔ اس نے کان بند کرنا چاہے ۔ نیند کا غلبہ طاری تھا مگر وہ سو نہیں پا رہا تھا ۔ دماغ میں کوئی چیز کنکھجورے کی طرح رینگ رہی تھی اور ساری حسیں بیدار تھیں ۔ اُس نے آوازوں کو جھٹکا تو بند آنکھیں اندر ہی اندر کہیں پوری کھل گئیں ۔

وہ یہاں کل سویرے آیا تھا ۔ سات بجے والی گاڑی سے ۔ اسٹیشن پر اُسے لینے جو لانبی سی چمکدار ایر کنڈیشنڈ کار آئی تھی اسے دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے ۔ مگر اس نے چہرے سے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا ۔ وہ بےحد باوقار اور متین لڑکا تھا ۔ وردی پوش ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ایک بے حد سمارٹ اور خوش پوش نوجوان باہر نکلا ۔

آپ غالباً کنول شرما ہیں ـــــ اس نے کنول کی طرف بڑھتے ہوئے انتہائی

مہذب اور خلیق لہجے میں کہا تھا۔

میں دیپک ہوں۔ دیپک یا جینی۔ معاف کیجیے گا میں نے بھیڑ میں جانے سے بہتر یہی سمجھا کہ یہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں۔ دوسرے آپ مجھے پہچانتے بھی نہیں تھے۔ میں نے بھی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔

کنول کے لبوں پر اس کی مخصوص دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ رسمی گفتگو کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی جیسے ہوا میں تیرنے لگی۔ کوئی بیس منٹ بعد وہ جس بنگلے میں داخل ہوئی وہ اس گاڑی کے ہی لائق تھا۔ وسیع وعریض لان پر دور دور تک مخملی گھاس بچھی ہوئی تھی اور گلابوں کے تختے پھیلے ہوئے تھے۔ گاڑی کے اندر داخل ہوتے ہی تین چار خواتین لپکیں —— ایک لانبی گوری چٹی قدرے موٹی لیکن بیحد باوقار خاتون کو وہ انداز سے پہچان گیا۔ فرنچ شفان میں ملبوس کسی فرنچ خوشبو میں بسی وہ عورت یقیناً خاتون مخانہ تھیں دوسری طویل قامت اور چھریرے بدن والی ادھیڑ عمر عورت بھی کنارے دار بے داغ سوتی ساری میں بہت اچھی لگ رہی تھیں ان کے بالوں میں پھولوں کی وینی تھی۔ باقی دو نوجوان لڑکیاں تھیں۔ فیڈڈ جینز اور ریشمی کپڑے کے بلاؤز میں ملبوس وہ عام کالج گرلز کی طرح تھیں لیکن ان کے گرد ایک ہالہ تھا۔ بے پناہ اسمارٹ نس اور بے پناہ خود اعتمادی کا ہالہ جو دولت اور اطمینان کی فراوانی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

یہ ممی ہیں دیپک نے موٹی خاتون کی طرف اشارہ کیا —— یہ الکا یہ شبنم —— اور یہ اس نے طویل قامت، خاتون کی طرف اشارہ کیا جس نے بالوں میں موگرے کی وینی سجائی ہوئی تھی —— انھوں نے ہم لوگوں کو پالا ہے —— آیا ماں۔ ہم لوگوں کو بے حد چاہتی ہیں۔

تو یہ ان لوگوں کی گورنس ہے۔ کنول نے بیک وقت سب کے لئے ہاتھ جوڑتے ہوئے سوچا۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کی تصویر گھوم گئی۔ ماں کی ساڑی کبھی بے داغ نہیں ہوتی تھی علاوہ ان دو چار کبھی کبھی آنے والے دنوں کے جب وہ کہیں جا رہی ہوتی تھیں۔ ان کے بالوں میں اتنی چمک بھی نہیں تھی اور پھول تو شاید انھوں نے کبھی نہیں سجائے

تھے۔ عموماً وہ ایک گنجلی ہوئی میلی ساری میں ملبوس کبھی اس کے پلو سے ہاتھ پونچھتی نظر آتیں، کبھی ماتھے سے پسینہ۔ گھر میں پیسوں کی ایسی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ ماں کے رہنے کا ڈھنگ ہی بن چکا تھا۔

کنول کو ایک عجیب سی بے کلی کا احساس ہوا جو انگیٹھی کے دھوئیں کی طرح چکر کاٹتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کے اندر اٹھ رہی تھی۔

ایک ملازم اس کا سوٹ کیس اٹھا کر مہمان خانے میں رکھ آیا تھا اور وردی پوش بیرا چاندی کی ٹرے پر بھاپ اٹھتی کافی کے پیالے لیکر اندر آچکا تھا۔

نہانے کے بعد ناشتے کی میز تک آتے آتے کنول سب لوگوں سے خاصی بے تکلف ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے چند گھنٹوں کے اندر ہی اس قدر اپنائیت اور بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا کہ اس کی ساری جھجک رخصت ہو چکی تھی۔ دوسرے دن ان لوگوں نے اسے گھمانے کا پروگرام بنایا۔ دیپک، الکا، شبنم اور دیپک کی کنیڈین منگیتر ایلین۔ پارک میں اکثر گھومتے ہوئے پورے وقت دیپک، شبنم اور ایلین ذرا پیچھے رہ جاتے یا آگے بڑھ جاتے اور الکا اس کے ساتھ رہ جاتی۔ سب کچھ سوچے سمجھے پلان کے تحت ہو رہا تھا۔ خیر وہ آیا بھی تھا الکا کو ہی دیکھنے۔ الکا کو دیکھنے یا اپنے آپ کو دکھانے؟

برگیڈیر عثمانی سے اس کے ماما کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ وہ بھی ملٹری میں تھے کنول کے آئی۔ اے۔ ایس میں آجانے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی۔ وہ ہمیشہ سے ہونہار تھا اس لئے کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ لڑکیوں والے پہلے ہی سے اس کے گھر کے چکر کاٹ رہے تھے۔ مگر برگیڈیر عثمانی کی معرفت جو رشتہ آیا وہ بقول ماما سب سے زیادہ "دھانسو" تھا۔ ویسے انھوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ لڑکا ہی لڑکا ہے ان کے یہاں — شان و شوکت ڈھونڈنا ہے تو اپنی ٹکر کے لوگوں میں جائیے۔

وہ باجی میرے پیچھے پڑا ہے کہ خاندان میں کوئی آفیسر نہیں ہے۔ سب بزنس میں لگے ہیں۔ دولت کے ساتھ تھوڑا اقتدار ہونا ضروری ہے۔ بزنس کلاس میں

بڑا افسر نہ آئے تو لگتا ہے بڑا ڈھنڈار محل تو بنوا لیا لیکن آرائش کے لئے کچھ نہیں خریدا - اکلوتا بیٹا گریجویشن کے بعد امریکہ چلا گیا بزنس مینجمنٹ کے لیے - اُسے افسر بنوا دیتے تو پھر بعد میں یہ لاتنا چوڑا دھندا کون سنبھالتا - رہی لڑکے کے "سیلف میڈ" ہونے کی بات تو میاں وہ بیٹی کو اتنا دیں گے کہ خود بخود وہ ان کے طبقے میں شامل ہو جائے گا -

اور لڑکی ـــ ماما نے سارے شک رفع کر لینے چاہے تھے - لڑکی بہت سوئیٹ ہے اور کم عمر بھی کنول کو یقیناً پسند کرے گی - پھر انھوں نے ذرا جھک کر قدرے رازدارانہ انداز میں کہا تھا ـــ

میرا خیال ہے وہ لوگ شادی جلدی چاہیں گے - ٹریننگ کا انتظار کر کے دو سال نہیں گنوائیں گے - اونچے طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں گمراہی تیزی سے پھیل رہی ہے - منشیات آوارگی اور نہ جانے کیا کیا - جن لوگوں میں پرانی اقدار کی رمق باقی ہے وہ دھڑا دھڑ شریف لڑکے ڈھونڈ کر لڑکیاں بیاہ کر رہے ہیں -

پھر ماما نے دھکے دے دے کر اسے یہاں بھجوایا تھا - ٹریننگ پر جانے کے دن قریب آرہے تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس سے پہلے کہ کنول کو کوئی ایسی ویسی لڑکی ہڑپ لے وہ یہاں اس کی منگنی کرا دیں -

انکا واقعی بے حد سوئیٹ تھی لیکن اس کی سمجھ سے بالاتر - اس نے جینز کے ساتھ سڈول پیروں میں پائل سے ملتا جلتا چاندی کا کوئی زیور پہن رکھا تھا - پائینچے چڑھے ہونے کی وجہ سے اس کی پنڈلیوں کا کچھ حصہ نمایاں تھا فلیٹ چپلوں کے ساتھ وہ زیور گورے نازک پیروں پر بھلا ضرور لگ رہا تھا لیکن باقی کی ساری میک اَپ ڈریس اس زیور سے ذرا میل نہیں کھاتی تھی - زیور خالص ہندوستانی تھی اور لباس خالص مغربی - دلکش چہرے کے نازک ہونٹوں کی لپ اسٹک مغربی تھی اور ہونٹوں کے پیچھے کی زبان بھی مغربی -

اس وقت کنول کے ذہن میں بڑا بے تکا سا خیال آیا - اگر انکا سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ بھی اسی چاندی کے زیور جیسا لگے گا - اپنی جگہ خوبصورت اور

شاید الکا کو عزیز بھی مگر کم قیمت ۔ ساری بیک گراؤنڈ سے الگ ـــــ بے میل جیسے بے سُر تال کا سنگیت ۔ اور فطری انداز میں بات کرتا ہوا کنول اچانک بے حد کانشس ہو گیا ۔

الکا اسے اپنی پسندیدہ چیزیں بتا رہی تھی ـــــ تیرنا، گھڑ سواری، جیمز ہیڈلے چیز کے ناول، ویسٹرن ڈانسنگ، سیاحت اور اطالوی کھانے ۔

تم اٹلی ہو آئی ہو ۔

میں آدھا یورپ گھوم چکی ہوں ۔ اس نے بچکانہ مسرت کے ساتھ کہا ۔ روم میں میں نے ایک ہاؤس وائف سے وہاں کی مقبول ڈش Pizza بنانی سیکھی تھی اب میں خود بیک کر لیتی ہوں ۔

تم کھانا پکا لیتی ہو ۔

الکا کے چھوٹی سی عمر میں آدھا یورپ گھوم آنے کی بات نے کنول میں جو کھسیاہٹ بیدار کی تھی وہ حیرت میں ڈوب گئی ۔

کبھی کبھی ـــــ الکا کا مختصر سا جواب تھا ۔

میری ماں کے دھوئیں سے بھرے کچن میں پکا سکو گی ؟ کنول کی زبان پہ یہ فقرہ آتے آتے رہ گیا ۔

تمہاری ہابی کیا ہے ـــــ ؟ الکا اس سے پوچھ رہی تھی ۔

میری ہابی ـــــ ؟ کنول نے اس سوال پر کبھی غور نہیں کیا تھا ۔ آئی ۔ اے ۔ ایس انٹرویو بورڈ میں بیٹھے ہوئے بھاری انٹلیکچوئیل نظر آنے والے، چشمے کے پیچھے چھپی ذہین آنکھوں سے اندر کی اسکریننگ کر لینے والے گورنمنٹ آف انڈیا کے پرانے منجھے ہوئے افسروں کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے وہ قطعی نروس نہیں ہوا تھا لیکن یہ اٹھارہ سالہ نازک اندام ناتجربہ کار لڑکی اسے نروس کر رہی تھی ۔

کرکٹ کھیل لیتا ہوں ۔

کرکٹ مجھے بے حد پسند ہے ۔ وہ خوش ہو کر بولی ۔ ابھی جو پاکستانی ٹیم آئی تھی

جہاں جہاں میچ ہوئے ہم لوگ وہاں وہاں گئے۔ اس کے سارے کھلاڑیوں کے آٹو گراف میرے پاس ہیں۔ وہ کمبخت عمران خان ——! VOW کیا پرسنالٹی ہے۔ اس نے ایک ننھی سی کنکری اٹھا کر پاس بنے مصنوعی تالاب میں پھینکی۔ کنارے بیٹھے دو چار مینڈک اچھل کر بھاگے۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ بڑی پیاری معصوم سی ہنسی۔ زندگی اور اس کے حسن سے بھرپور۔ پھر اس نے چیونگم کا پیکیٹ پھاڑا اور دو پیس کنول کی طرف بڑھائے۔ چیونگم لیتے ہوئے کنول کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ لانبی ملائم۔ صاف رنگت والی انگلیاں ان کا لمس ایسا ہی تھا جیسے ان زرد گلابوں کا لمس جو کنول کے کمرے میں سجا دیے گئے تھے مگر کنول کے جسم میں کوئی ارتعاش نہیں پیدا ہوا کوئی برقی رو نہیں جاگی۔

کنول کو ذرا سا تعجب ہوا۔

اسی وقت پیچھے کے باقی لوگ ان کے پاس پہنچ گئے۔ ایک پیڑ کا سایہ تلاش کیا گیا۔ کار میں بیٹھا ملازم ٹفن باسکٹ لے کر آ رہا تھا۔ باسکٹ میں دسیوں کھانوں کے ساتھ شفاف کھڑکھڑاتے نیپکن اور چمکتے ہوئے چھری کانٹے بھی تھے —— کنول کو چھری کانٹوں کی عادت نہیں تھی اس لئے کھاتے وقت کھانے سے زیادہ اس کی توجہ اس بات پر تھی کہ اس کوئی حماقت سرزد نہ ہو۔ ویسے وہ بیحد ٹھنڈے مزاج والا لڑکا تھا اور ہر ایرے غیرے سے بغیر ہڑبڑائے ہوئے نمٹ لیتا تھا۔ کامیاب افسر کی پہلی کوالیفکیشن۔

وہ سب کھاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ دیپک انکا کے اسکول کے دنوں کے قصے سناتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یہ جب مسوری میں پڑھتی تھی....

دیپک کو اپنا پرائمری اسکول یاد آ گیا جہاں کی شکستہ بلڈنگ سے اس نے پانچویں کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا اور دھوتی پہنے ناک کی پھنگ پر چشمہ لگائے ماسٹر گردھاری لال نے بابو جی سے کہا تھا کہ یہ لڑکا بہت ہونہار ہے۔ اس کی پڑھائی پر خاص دھیان دیں۔

دراصل دیپک یہاں آتے ہی دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ ساری

گفتگو میں حصہ لے رہا تھا اپنی شگفتہ مزاجی اور حاضر جوابی سے سب کو ہنسا رہا تھا اور دوسرا حصہ اندر کبھی کہیں پہونچ جاتا تھا کبھی کہیں۔

اس نے انکا کی طرف غور سے دیکھا۔ شاید دونوں کی جوڑی بڑی خوبصورت لگے گی۔ مگر اندر سے وہ ہمیشہ دو ٹکڑوں میں بٹا رہے گا۔ بڑا افسر بن کر بھی وہ انکا کے طبقے کا ایک فرد نہیں بن سکے گا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد وہ جن ٹکڑوں میں تقسیم ہوا ہے وہ مل کر کبھی ایک نہیں ہو پائیں گے۔ اس کی جڑیں ایسے گھر میں پوشیدہ ہیں جس کی ماہانہ آمدنی انکا کے یہاں روزانہ خرچ کے زمرے میں آتی ہے۔ کچن میں پیڑھی پر بیٹھ کر چٹخارے مار کر دہی کے ساتھ آلو کے گرم پراٹھے کھاتا ہوا کنول ڈائننگ ٹیبل پر سلور کٹلری کے ساتھ اٹالین Pizza یا چائنیز چلی چکن کھاتے ہوئے خود کو ایسا محسوس کرے گا جیسے برساتی اوڑھ کر بارش میں گھومتا ہوا شخص خود کو پانی سے الگ محسوس کرتا ہے۔

انکا اب اپنا نیپکن گود میں پھیلا رہی تھی۔ سڈول پیر کراس کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے پیر کا زیور پھر نمایاں ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا انکا اسے کیا کہتے ہیں؟

کسے۔ اس نے مسکراتی آنکھوں سے پوچھا۔

یہ تمہارا زیور —— ؟

ANKLET

تمہارا مطلب ہے پائل ——

شاید ——

اس کی ہندی ایلین کی ہندی سے بھی بدتر ہے۔ اسکول میں یہ ہمیشہ ہندی میں فیل ہوتی تھی۔ دیپک نے پھر چھیڑا۔

باہر کا کنول انکا کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور اندر کا کنول سوچنے لگا کہ پائل کو پائل نہ کہہ کر اگر Anklet کہہ دیا جائے تو بھی وہ اس سارے بدیسی لباس میں کبھی

نہیں کھلتی ۔ اچانک وہ زور سے ہنس پڑا — اس کے ذہن میں ایک نیم پلیٹ آگئی ۔

کنول کمار شرما پائل آئی ۔ اے ۔ ایس ۔

اور اب سارے دن گھوم پھر کر شدید تھکن کے باوجود مخمل سا بستر کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا ۔ وہ ماما سے ، ماں سے ، بابوجی سے کیا بہانہ بنائے گا ؟ کیا کہے گا کہ اس قیمتی فریم میں فٹ یہ حسین تصویر اسے کیوں نہیں پسند آئی ؟

○

آنٹی ایملی

"دُر فٹے منہہ، پھر اُسی کُھچڑی کا ذکر۔ لے یہ کھا اور یہ کھا" —— اور لاپٹو ہاؤس کلکتہ کی فارغ التحصیل حسین نازک اندام تیجندر کور بیدی نے جو عرف عام میں تیجی کہلاتی تھی اور گھر پر خالص پنجابی Slang میں گفتگو کرتی تھی اور "دُر فٹے منہہ" جس کا تکیہ کلام تھا۔ پنیر پکوڑوں کی پوری پلیٹ تقریباً میرے منہہ میں ٹھونس دی۔

"دیکھ تیجی اب مجھے چلنا ہے میں نے ایملی آنٹی کو وقت دیا ہوا ہے۔ اور وہ جو کہا ہے میں نے مس جیمز سے بات کرنے کے لئے ......" "دُر فٹے منہہ۔" اس نے اسٹریو اتنا تیز کر دیا کہ میری آواز ہی ڈوب کر رہ جائے —— "سردار اسے نہیں ملے گی —— ؟" اُس نے اسٹریو کی آواز سے اونچی آواز میں چلاّتے ہوئے کہا، "جانے کب آئیں گے۔ ارے بھئی میں کب تک بیٹھوں۔ اب آ بھی چلا، شام ڈھل رہی ہے۔ دارو کی طلب ستا رہی ہو گی سالے کو۔ دیر نہیں کرے گا۔" اور تیجی کے اس جملے کے ساتھ ہی الہ دین کے چراغ کے دیو کی طرح سردار گوربچن بیدی دروازے میں نمودار ہوئے اور دروازے کا فریم اُن کے لانبے چوڑے جسم سے بھر گیا۔ ہنس مکھ، خوش مزاج، یار باش، تیجی اور بچوں کو ٹوٹ کر چاہنے والا، فکر فردا سے بے نیاز سردار کے ہاتھوں میں دو تھیلے تھے۔ ایک میں مچھلیاں بھری تھیں اور دوسرے میں دو شامت کے مارے مرغے۔

تیجی نے آیا کو پکارا ——

ارے آپا کو کیوں پکار رہی ہے - یہ جو ہے صوفیہ -

"بھیا آج تو معاف ہی کیجئے گھر میں نہیں پکاتی آپ کے مچھلی مرغے - ایک عدد بیوی، ایک عدد باورچن انہیں سے کام چلائیے - میں رکی تھی سلام کرنے کو یہ لیجئے آداب عرض --- بندی چلی ---

گورنچن نے مجھے دونوں شانوں سے پکڑ کر صوفے پر تقریباً رکھ دیا -

کیوں کسی سے اپوائنٹمنٹ ہے کیا ؟ انھوں نے آنکھ ماری اور گھنی داڑھی کے اندر مسکرائے -

اپوائنٹمنٹ کیا خاک ہو گا اس کا - فٹے منہہ - وہی سالی کلچڑی اس کی سگی -

کون ہے بھئی وہ ؟ آٹھ برس ساتھ گذار کر بھی گورنچن کی سمجھ میں تیجی کی فصیح و بلیغ زبان ذرا مشکل ہی سے آتی تھی -

ارے وہی گھوڑے جیسی لاتوں والی - اس کے لئے پریشان ہے یہ -

ارے کچھ وضاحت بھی کر - گورنچن ہنس پڑے - وہ گھوڑے جیسی لاتوں والی یا یہ گدھے جیسی دولتیاں جھاڑتی صوفیہ --- کون کس کے لئے پریشان ہے ؟

قسم خدا کی پھٹکار ہے تم دونوں پر - ذرا زبان تو دیکھو، لکھنؤ کا نام ڈبو دیا -

"ئے شو --- یہ تیجی کا دوسرا تکیہ کلام تھا - اس لکھنؤ والی دے لکھنؤ دا نام بھی ڈوبنے لگا - چل چل - اور اس نے مجھے کچن کے اندر دھکا دیکر باہر کے دروازے کی چٹخنی بند کر دی -

وہ بھی آ رہا ہے ٹھاکر - گورنچن نے باہر سے ہانک لگائی - اور صافہ کھول کر دھپ سے مسہری پر بیٹھا - ٹھاکر کے نام پر میری اور تیجی کی آنکھیں ملیں اور ہم دونوں کورس میں ہنس پڑے -

لطیفے باز مسکین صورت چھ فٹے ٹھاکر رمیش سنگھ کی دیہاتی بیوی کے سامنے دارو کا نام لینا بھڑوں کے چھتے پر پتھر پھینکنے کے برابر تھا - ٹھاکر زیادہ تر یہیں آکر پیتے تھے، تیجی نے پریشر کوکر میں مکھن ڈالا اور میں نے مرغوں کے ٹکڑے کرنے شروع کر دیے -

گوربچن اور ٹھاکر کی وہسکی اور تیجی کی گملٹ کے سامنے وہ لائم جوس کا گلاس انتہائی ذلیل نظر آرہا تھا لیکن مرغ بے حد لذیذ تھا اور مچھلیاں بے حد کُرکُری۔ گوربچن مچھلی کے کانٹے تک کھا گئے۔ اور ٹھاکر کے لطیفوں کے درمیان ہنستے ہنستے ہم سب کے جبڑے دکھ گئے۔ بارہ بجتے بجتے ٹھاکر نے ہار مان لی اور تیجی کے الفاظ میں ٹلیٹ ہو گئے۔

"چل صوفیہ اسے پھینک آئیں۔ اور ہم سب کار میں لد پھند کے پہونچے ٹھاکر کے گھر"

ٹھاکر ڈولی ڈنڈا کر کے اتارے گئے اور ان کی بیوی ان کے استقبال کو یوں وارد ہوئیں کہ ان کا سیدھا ہاتھ ان کی کمر پر رکھا ہوا تھا اور الٹے ہاتھ میں بیلن تھا۔ سیدھے پلے سے سر ڈھانپے وہ شرابے برساتی آنکھوں سے ہم سب کو گھور رہی تھیں۔ بیلن کی شانِ نزول میرے خیال میں کچھ یوں تھی کہ وہ بیچاری انتظار کرتے کرتے بارہ بجے رات کو کچن میں گھسی تھیں روٹیاں پکانے کو مگر تیجی کا کہنا تھا کہ ٹھاکر اکثر بیلن سے پٹتے رہتے ہیں۔ اچانک یہ سارا منظر اُن کی برداشت سے باہر ہو اٹھا تھا اور انھوں نے خالص اودھی میں بے نقط سنانی شروع کیں۔ تیجندر نے دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا اور گوربچن انتہائی سنجیدہ چہرے کے ساتھ الگ کو کھڑے ہو گئے۔

بھابی میں نے چوتھے پیگ کے بعد ہی ان سے کہا تھا کہ بھیا بس کرو۔ اس سے زیادہ تمہارے بساط کی نہیں ہے مگر ان کی کھوپڑی تو تیسرے میں ہی آؤٹ ہو چکی تھی سمجھ میں کیا خاک آتا۔

گوربچن کے باپ ۴۷ء کے آس پاس لکھنؤ آکر بس گئے تھے اس وقت گوربچن کی عمر کوئی دس برس کی تھی۔ وہ خوب فراٹے سے نفیس اردو بولا کرتے تھے پنجابی بولتے تو ان کی ماں کہتیں کاکا ہندی میں پنجابی بولتا ہے۔

"بس رہنے دو اور جی نہ جلاؤ ہمرا۔ تمہیں بگاڑے ہو اِن کا"

تمہاری قسم میں نے تو پچھلی دیوالی میں ہی بوتلیں اُلٹ دی تھیں اور سارے جام توڑ دیے تھے۔ اسی مردود نے پھر لاکر رکھ دیا وہسکی کا پورا کریٹ اور تیجی پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ ٹھاکر کی مونچھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں اور سارے ماحول پر عجیب سی مسخری طاری تھی۔

ٹھاکر کو اوپر بھرا اور نیچے ان کی بیوی کی اماں میں دیکر گوربچن اور تیجی جب مجھے
ظہور بخش گرجا کے پیچھے ملگجی روشنی میں الستا وائی ڈبلیو سی اے کی چھوٹی سی صاف ستھری عمارت
میں چھوڑ آئے، تو تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ سکریٹری کے آفس میں روشنی دیکھ کر
میری جان نکل گئی۔ اور تیجی ایڑی کے سینڈل کھٹکھٹاتی وہ کسی بلی کی سی پھرتی کے ساتھ
سامنے آگئیں"۔ کس کے ساتھ آئی ہو؟ وہی تمہارا سردار دوست؟"

"معاف کیجئے دوست نہیں دوست کا شوہر"

comes to the same اور یہ واپس آنے کا وقت نہیں ہے۔ اتنی دیر
سے آنا ہو تو رات باہر ہی گذار لیا کرو۔ ان کا لہجہ تیزاب میں بھیگا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے
دانت بھینچتی سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ بٹر چکن، چھوٹی چھوٹی کرکری تلی ہوئی مچھلیاں، پراٹھے
اور ملائی والا دہی ۔۔ تیجی اور گوربچن کے قہقہے پھر وہ ٹھاکر کے گھر کا قہقہہ بار منظر اور اب ساڑھے
بارہ بجے رات کا یہ شدید اینٹی کلائمکس یعنی مس جیمز کا زہر خند ـــ آنٹی ایملی ذہن سے
قطعی اوجھل رہیں کہ ان سب چیزوں کے درمیان ان کا قطعی گذر نہیں تھا۔ وہ دنیا کی
انتہائی غیر دلچسپ اور غیر اہم شخصیت تھیں جو نہ قہقہوں میں شریک تھیں نہ دکھوں میں۔ ایسے
موقعوں پر صرف نظر انداز کی جاتی تھیں۔ کمرے میں داخل ہوئی تو میری آسامی روم میٹ ڈگلیانی
جسے 'س' کا بہت زیادہ استعمال کرنے کی وجہ سے ہم سب 'سلیانی' کہا کرتے تھے خراٹے
بھر رہی تھی۔ میرے بیڈ سے ملحقہ چھوٹی سی رائٹنگ ٹیبل پر میرا پیڈ اور پین دونوں
کھلے رکھے تھے آنٹی کی تحریر میں نے فوراً پہچان لی۔ دو گھنٹے تک میرا انتظار کرنے کے
بعد وہ مایوس ہو کر واپس لوٹ گئی تھیں، لکھا تھا پھر کبھی آئیں گی۔ الفاظ کچھ پھیلے
پھیلے سے تھے جیسے ان پر کوئی روتا رہا ہو ـــ مجھے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔
آنٹی ایملی کی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں کمرے میں چاروں طرف بکھر گئی تھیں۔ بے چاری!
اتنی دور سے آئی ہوں گی۔ دو جگہ بس تبدیل کی ہو گی۔ اگر حضرت گنج میں ہی اتر گئی ہوں گی
تو کچھ دور پیدل بھی چلنا پڑا ہو گا۔ پھر یہاں آکر دو گھنٹے کا انتظار ـــ وہ بھی بے سود

میں نے میگزین سمیٹے۔ ایک میگزین کے نیچے بسکٹوں کا ایک پیکٹ رکھا ہوا تھا۔ آنٹی ایملی کبھی خالی ہاتھ نہیں آتی تھیں۔

برٹش راج میں صرف اعلیٰ افسروں اور رجواڑوں کے بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھا کرتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں ہر شخص اپنے بچے کو انگریزی میڈیم میں پڑھانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انگریزی اسکول برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہو گئے ہیں۔ آنٹی ایملی بھی ایسے ہی ایک بھٹیجر سے انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ منیجر تنخواہ تو صرف تین سو دیتا تھا لیکن آنٹی سے مرعوب بہت تھا اس لئے کہ اس کے اسکول میں آنٹی ایملی سمیت صرف تین استانیاں ایسی تھیں جن کی مادری زبان انگریزی تھی باقی سب نسلاً خالص تھیں لیکن انگریزی دوغلی بولا کرتی تھیں۔

ایملی آنٹی سے میری ملاقات میری گوا کی دوست ریٹا مینیزز کے ذریعہ ہوئی تھی۔ ریٹا کی ماں سے انھوں نے کچھ دور دراز کی رشتہ داری نکال لی تھی۔

"میری ماں اور ریٹا کی نانی گوا کے ایک ہی گاؤں کی تھیں۔" انھوں نے خالص دیسی انداز میں بتایا تھا۔ "ہمارے اجداد آئنگر برہمن تھے۔ کبھی گوا آ کر بس گئے تھے اور انہیں پرتگالی مشنریوں نے عیسائی بنایا تھا۔ پھر کچھ پرتگالیوں نے ہمارے خاندان میں شادی بیاہ بھی کئے تھے۔"

انھوں نے بڑے فخر سے بتایا تھا۔ "میری ماں بہت گوری تھیں۔" آنٹی ایملی خاصی سانولی تھیں اس لئے اپنی ماں کی رنگت کا تذکرہ ضرور کرتی تھیں۔ ان کے اجداد برہمن تھے یا ہریجن، مجھے اس کے شجرے کی صحت سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر آنٹی ایملی ایک بہت دلچسپ کیس معلوم ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی کے سائیکولوجی ڈیپارٹمنٹ کی ایک ریسرچ اسکیم میں کام کرتے کرتے ہر فرد مجھے ایک کیس معلوم ہونے لگا تھا اور تیجی کا کہنا تھا کہ میں خود ایک کیس بنتی جا رہی ہوں۔

ریٹا کے یہاں جب میں پہلی بار ان سے ملی تو ریٹا نے ان کا تعارف ان

الفاظ میں کرایا تھا۔ یہ ہماری آنٹی ایملی ہیں، بڑی سوئیٹ، بڑی نیک۔ ایک اٹالین پادری ان پر بُری طرح عاشق ہے مگر مشکل یہ ہے کہ رومن کیتھولک ہے بیچارہ۔ بیاہ نہیں کر سکتا۔ میں نے بیوقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ لانبی بے ڈول۔ دبلی بے رونق، سانولا بلکہ مٹیالا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جن میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اونچا سا پرانی وضع کا بدرنگ اسکرٹ جس میں سے سوکھی سوکھی پنڈلیاں جھانک رہی تھیں۔ مجموعی حیثیت سے وہ مجھے کسی اونٹ سے مشابہہ لگیں۔

یہ کوئی سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اور ریٹا ایم اے فائنل کر رہے تھے۔ گو بیکن کی اس وقت نئی نئی شادی ہوئی تھی اور کلکتے کی گریجویٹ تھی کو میرے پیارے شہر لکھنؤ میں سوشل اور کلچرل سرگرمیوں کی کمی معلوم ہوئی تھی۔ اُکتا کر اس نے بھی ایم۔ اے جوائن کر لیا تھا۔ اور یوں، میرے اور ریٹا کے حلقے میں شامل ہو گئی تھی۔ اب ان سب باتوں کو ایک تُگ بیت گیا ہے۔

ہاں تو اُس وقت میں نے اونٹ سے مشابہہ آنٹی ایملی کے ساتھ کسی اطالوی پادری کی ذہنی شبیہہ بنائی اور دل ہی دل میں انتہائی بدتمیزی سے ہنس پڑی۔

کچھ دن بعد ریٹا نے مجھے فادر سلوانو سے ملایا۔ حضرت گنج کی جگمگاتی روشنیوں، ریستورانوں، پوش دکانوں اور حسین عورتوں کے رنگ برنگے آنچلوں کے درمیان کھڑی کیتھیڈرل کی پُرسکون عمارت کے اندر کی بے پناہ سنجیدگی اُداسی اور خاموشی کے اندر ڈوبے کھڑی وہ کسی سوکھی ماری اینگلو انڈین بڑھیا کو کٹھیا کی آزمودہ دوا بتا رہے تھے۔ نیلی آنکھیں، سنہرے بال، سنہری داڑھی، لانبا قد، چھریرا بدن، تقریباً جوان عمر، چہرے پر پاکیزگی جو دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ ہو جانے پر پیدا ہوتی ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ یار ریٹا وہ آنٹی ایملی ——

شش، شش، ریٹا نے مجھے خاموش کرا دیا اور اندر جانے کے لئے سر پر اسکارف باندھنے لگی۔ فائنل امتحان قریب آ رہے تھے۔ میں نے بھی سر پر آنچل درست کیا اور کیتھیڈرل کے اندر بڑے ہال میں گھٹنوں کے بل جھک کر دعا کی "یا پاک پروردگار! اپنے محبوب بندوں حضرت مسیح اور صدیقہ مریم کے طفیل" —— مگر خاک جی نہ لگا اور آنکھوں کے آگے اونٹ جیسی آنٹی ایملی ناچتی رہیں۔

فادر سلوا نو بڑے دلچسپ انسان تھے - اُس دن میں شدید ڈپریشن کا شکار تھی - ابا کا خط آیا تھا - وہ اگلے ماہ ریٹائر ہو رہے تھے - ہم سب چھ بھائی بہن تھے اور ابھی چہ جائیکہ شادی بیاہ اور نوکریاں، کسی کی تعلیم تک مکمل نہیں ہو سکی تھی - مجھے اپنے رزلٹ کی شدید فکر تھی اور اس کے بعد نوکری کی بھی - چند منٹوں میں میں اُن سے کھل گئی اور سب کچھ کہہ ڈالا - انھوں نے کتنی تسلی دی کتنا ہنسایا - کتنے سارے لطیفے سُنائے چلتے وقت وعدہ کیا کہ میرے لئے دعا کریں گے - میں اپنے سارے مسائل کینتھیڈرل میں چھوڑ آئی - مگر ایک سوال ذہن میں ناچتا رہا —— آنٹی ایملی اور فادر سلوا نو ؟

واپسی میں برٹش کاؤنسل لائبریری کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ریٹا نے بتایا —— تُو تو نری گاؤدی ہے - آنٹی ایملی بڑی پابندی سے "کنفیشن" کے لئے جایا کرتی تھیں - گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے - نہ جانے کس سے حاملہ ہو گئی تھیں - اسقاط کروا دیا - کھا مڑ بھی زبردست قسم کی ہیں کروایا تھا سو کروا یا لیکن شدید احساس گناہ میں مبتلا ہو گئیں - فادر سلوانو کی شخصیت دیکھی تم نے انھوں نے سہارا دیا - ان کے دُکھ بانٹے - اب آج کل وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ان پر عاشق ہو گئے ہیں -

اور آنٹی ایملی —— ؟ میں نے سوال کیا -

بس چلے تو کھال کی جوتیاں بنوا دیں —— ریٹا نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا -

بے چاری ! میں نے ٹھنڈی سانس لی - میں خود اتنی ذرا سی دیر میں فادر سلوانو پر عاشق ہوتے ہوتے بچی تھی -

بے چاری وے چاری کچھ نہیں - زبردست ایڈریسٹ ہیں - تمہاری سائیکلوجی کی اصطلاح میں اسے کیا کہتے ہیں جو ہر وقت خواب دیکھتا رہے ؟

میں خود خوابوں کی دنیا میں رہا کرتی تھی جہاں اماں کا دمے کا مرض بالکل ٹھیک ہو چکا ہو، ابا ابھی ریٹائر نہ ہو رہے ہوں - بھیا کی اور میری نوکری لگ گئی ہو اور باقی چار چھ چھوٹے بھائی بہن آرام سے پڑھ رہے ہوں - ایک بڑا سا مکان، خوش حالی تحفظ - احساس تحفظ

جو جب ہی بیدار ہوتا ہے جب قلعے کی دیواریں مضبوط ہوں اور خواب زیادہ دیکھنے کا مطلب ہے کہ قلعے کی دیواریں مضبوط نہیں ہیں۔

اور آنٹی ایملی کے قلعے کی دیواروں کی مضبوطی کا کیا ذکر۔ وہ تو کسی نے پورا کا پورا تہہ و بالا کر دیا تھا۔ وہ پیدا ہی ہوئی تھیں کھنڈروں کے درمیان۔ تیس سال کی عمر میں وہ کسی ننھے بچے کی طرح تھیں جو محبت کو صرف نظروں اور ہاتھ کے لمس سے پہچانتا ہوا اور ایک مختصر سی محبت بھری نگاہ، ایک چڑیا کے پروں جیسے لمس پر کھنچا چلا آتا ہو۔ انھوں نے میری نگاہوں کی ہمدردی کو پہچان لیا تھا اور مجھ سے، جو دس آٹھ نو برس چھوٹی، زندگی کی جدوجہد کرتی، تجربہ کاروں کی دنیا میں ایک ناتجربہ کار طالبہ سے یوں چمٹ گئیں جیسے کمزور بیل کسی تناور درخت سے چمٹا کرتی ہے۔

ریٹا مزے لیکر ان کے قصے سناتی تھی۔ آج آنٹی ایملی نے اپنے ذرا ذرا سے چھوٹے بالوں میں رجنی گن دھا کا چھوٹا سا گچھا سجایا تھا۔ وہ انہیں خادر سلوانو نے دیا تھا۔ دوسرے دن اس نے اطلاع دی۔ وہ گچھا مرجھا گیا تو انھوں نے اسے پانی کے گلاس میں ڈال دیا اور دیر تک اس کی طرف تکتی رہیں۔ وہ کھی کھی کر کے ہنسنے لگی۔ She is such a mad cap پتہ نہیں ممی نے کیوں انہیں گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ریٹا میری ہم عمر تھی مگر پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹی۔ سب کی لاڈلی۔ سب اچھی خاصی نوکریوں سے لگے ہوئے تھے۔ باپ کی بیکری تھی۔ اور ایک نکھٹو اینگلو انڈین لڑکا الگ اس پر فدا تھا اس لئے پختگی ذرا دیر سے آ رہی تھی۔ مستقبل محفوظ ہو اور حال مسرت آگیں تو ذہن اپنا سفر بڑے ہولے ہولے طے کرتا ہے۔

ریٹا! میں نے کچھ فطری، کچھ زبردستی مسلط کی ہوئی سنجیدگی کے ساتھ کہا ——— "آنٹی ایملی ایک دُکھی روح ہیں"

اور تم دکھی روحوں کی ٹھیکیدار ——— یار تو کیتھولک کرسچن ہو جا۔ پھر نن بن جانا اس نے میری بات کاٹ دی تھی اور زور سے آئسکریم والے کو پکارا تھا۔

سال بھر کے اندر اندر آنٹی ایملی نے ریٹا کا گھر چھوڑ دیا - فادر سلوانو والے معاملے کو لیکر ریٹا کے ممی نے بڑی جھاڑ پلائی تھی کہ وہ ایک پادری کو بدنام کر رہی ہیں - پھر ریٹا کے سارے بھائی مل کر اُن کا بڑا ناک میں دم کرتے تھے -

" آنٹی — آج فادر سلوانو نے لنچ میں تلے ہوئے گھونگھے کھائے تھے - آپ کے لئے بھی لادوں ؟" لوجین کہتا -

" ایملی آنٹی - فادر سلوانو آنڈر (order) چھوڑ رہے ہیں - انھوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے - بڑی خوبصورت ہے " ٹونی ہانک لگاتا -

تم کیا جانو — وہ بدحواس ہوجاتیں -

اخبار میں نکلا ہے آنٹی — جان انتہائی سنجیدہ اور اداس ہو کہتا -

اتوار کے دن سویرے سویرے نہادھو کر وہ سنگھار پٹار شروع کرتیں تو گھر میں بھونچال آجاتا - آنٹی رو رو دیتیں - ورکنگ وومن ہوسٹل کی جس تنہائی سے بھاگ کر انھوں نے گرتے مردے اکھاڑ اکھاڑ کر ریٹا کی ممی سے ناطہ جوڑا تھا وہ تنہائی کاتبِ تقدیر نے ان کی قسمت میں بڑی پکی روشنائی سے لکھی تھی - معمولی چھینٹے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے - انھوں نے ریٹا کا گھر چھوڑ دیا - اسکول منیجر کے معرفت انہیں ایک بڑے آرمی آفیسر کے وسیع و عریض بنگلے کے دوسرے سرے پر بنے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں سے ایک مل گیا - بدلے میں وہ اس آفیسر کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں - باقی کے دونوں کوارٹروں میں سے ایک میں مالی تھا اور دوسرے میں ڈرائیور - دونوں کی بیویاں سخت چھوا چھوت کی قائل تھیں اور آنٹی ایملی کی کھلی ٹانگوں کو انتہائی مشکوک نظروں سے دیکھتی تھیں - رہی وہ آرمی آفیسر کی بیوی — وہ بہت اونچے ستون پر ایستادہ تھی - آنٹی دونوں کے بیچ لٹکتی رہیں وہ No man's land کے زمرے میں آتی تھیں -

دن ڈھلے دلکشا کے کھلے کھلے علاقے میں رات جب جلدی اتر آتی اور صاحب میم صاحب کلب کی جگمگ کرتی روشنیوں میں برج کھیلتے اور مالی اور ڈرائیور کی بیویاں

اپنے اپنے بچوں کو لیکر جھلنگا چارپائیوں میں دبک جاتیں تو ہُو کے سناٹے میں سیاروں کی منحوس آوازوں کے درمیان آنٹی ایملی باربرا کارٹ لینڈ کے ناول پڑھتیں اور دل میں اٹھتے درد کو دباکر سوچتیں کہ ایسے دولت مند اور خوبصورت مرد اللہ نے جن لڑکیوں کی قسمت میں لکھے ہیں وہ کون سی دنیا کی مخلوق ہوا کرتی ہیں۔

ایم۔اے میں میرا فرسٹ کلاس نہیں آیا اس لئے لکچرر شپ نہیں ملی مگر سال بھر جھک مارنے کے بعد ڈیپارٹمنٹ نے مجھے ایک ریسرچ اسکیم میں لے لیا اور میں وائی۔ڈبلیو۔سی۔اے میں منتقل ہوگئی (یہ ہوسٹل بڑا ہی اُجاڑ ہے۔یہاں رہنے والوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔تیجی کا کمنٹ تھا) آنٹی ایملی نے اب مجھے عاقل و بالغ اور خود مختار "بڑوں" کے خانے میں رکھ دیا تھا اور مجھ سے کچھ زیادہ قریب آگئی تھیں۔

"تم ریٹا کی دوست ہو اور ریٹا میری بھانجی ہے اس طرح تم بھی میری بھانجی ہوئیں" ریٹا کی فیملی سے ایک قطعی اور آخری قطع تعلق کے بعد بھی وہ ان لوگوں سے اپنا رشتہ جوڑنے پر مصر رہا کرتی تھیں۔شاید اس طرح انہیں کسی بھرے پُرے کنبے کا ایک رکن ہونے کا احساس ہوتا تھا۔جھوٹا اور کھوکھلا سہی۔آنٹی انہیں کھوکھلے رشتوں پر زندہ تھیں۔ایک دن دھم دھم پڑتی ہوئی آئیں اور مجھے گلے سے لگا کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔میں حیرت زدہ رہ گئی آنٹی ایملی کا کوئی بھی ایسا قریبی عزیز نہیں تھا جس کے مرنے پر آنٹی دہاڑیں مارنے کی امید ہوتی ——

"فادر سلواتو اٹلی واپس چلے گئے" انھوں نے پرس سے ننھا سا لیس لگا رومال نکالا اور آنکھیں خشک کرتے ہوئے اطلاع دی۔مجھے پہلی بار ان پر بڑا غصہ آیا۔جلے کٹے لہجے میں بولی۔تو کیا آپ سمجھ رہی تھیں وہ واقعی آپ پر عاشق ہیں اور رہبانیت چھوڑ رہے ہیں؟

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ایک ایسے ننھے میمنے کی نظروں سے دیکھا جسے زبردستی اس کی ماں سے علیحدہ کردیا گیا ہو۔فادر سلواتو ایک خوشگوار خواب تھے۔مستقبل بعید کی ایک موہوم امید تھے۔جینے کا ایک سہارا تھے۔آنٹی بہت دنوں کے لئے انڈر گراؤنڈ ہوگئیں۔بعد میں مجھے اپنے جلے کٹے لہجے پر بڑا افسوس ہوا۔

ڈیپارٹمنٹ میں میری اسکیم کا کام تیزی سے چل رہا تھا۔ ریسرچ کا موضوع تھا ہندوستانی سائنس دانوں میں بڑھتا ہوا فرسٹریشن اور میں اکثر انتہائی بیزاری کے عالم میں سوچتی تھی کہ ساری دنیا میں بڑھتے ہوئے فرسٹریشن پر ریسرچ کیوں نہیں ہوتی۔ کس الّو کے پٹھّے نے کہا کہ فرسٹریشن صرف سائنس دانوں میں بڑھ رہا ہے۔ کام کی زیادتی میں میں آنٹی ایلی سے رابطہ قائم نہ کرسکی۔ اسی درمیان تیجی نے اطلاع دی کہ وہ آج کل پیس کور (Peace-corps) کے امریکن نوجوان کے ساتھ گھومتی نظر آتی ہیں اور اس اطلاع کے ساتھ ایک جملے کا اضافہ کردیا۔ "بڑی لوفر ہے سالی۔ دیکھنا ایک دن تجھے بھی لوفر بنا دے گی۔"

تم خود کو کس خانے میں رکھتی ہو؟ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا تھا۔ اور تیجی ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اس امریکن کو دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اس بار محسوس ہوا کہ آنٹی ایلی کی ناؤ کنارے لگ جائے گی۔ میلی جیکٹ بیو نرگی تپلون، انتہائی غلیظ پیلے دانت، گھوڑے جیسا لانبا منہ جو بھورے رنگ کے تلوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر یہ کہ خاصا احمق بھی تھا جیسا کہ اس سے گھنٹے بھر کی ملاقات میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ آنٹی ایلی کو بیاہنے کے لئے پرفیکٹ ہسبنڈ میٹریل (Husband material) مگر دو ماہ بعد آنٹی میرے شانوں پر سر رکھے رو رہی تھیں۔

کیا ہوا آنٹی؟

وہ ۔۔۔ وہ جو تھا نا جم۔ انھوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

خیریت تو ہے کیا ہوا جم کو؟ میں سمجھی اسے پولیس پکڑ لے گئی۔ کچھ اس کی صورت ایسی ہی تھی کہ اس کے متعلق سب سے پہلے یہی خیال آیا۔

ادہ نو ۔۔۔ وہ زور زور سے رونے لگیں۔

ارے کچھ بولئے بھی تو۔

وہ ٹچا مردود اس نے مجھے کیا سمجھا۔ میں اسے ایک گھر دینا چاہتی تھی۔ اس کے

بچوں کی ماں بننا چاہتی تھی۔ اپنے اور اس کے بچوں کی صوفیہ ـــ صوفیہ تمہاری سمجھ میں یہ سب کچھ آتا ہے۔ بولو؟ اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میں نے انہیں جی بھر کر رونے دیا اور خود ٹکر ٹکر بیٹھی منہہ تاکتی رہی۔ خوب رو لینے کے بعد انھوں نے باقی کہانی سنائی ـــ گھر در کی جم کو پرواہ نہیں تھی۔ پیسے کو تو بہانہ تھا۔ جس گھر اور سماج کی زنجیریں تڑا کر وہ بھاگا تھا آنٹی ایملی اسے پا بجولاں کر کے پھر اسی کے درمیان چھوڑ دینا چاہتی تھیں۔ بس جہاں تک رسی اجازت دے وہیں تک منہہ مارو اور گھوم گھام کر پھر تھان پر واپس۔ بچے جم کو زہر لگتے تھے ہاں اسے اس بات پر اعتراض نہیں تھا کہ آنٹی ایملی اس کے بچوں کی ماں بن جائیں۔ ان کی مرضی۔ پیدا کر لیں دو چار اور پالتی رہیں باقی زندگی۔ بہر حال اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ قبل اس کے کہ پر کترے جائیں وہ پھر سے اڑ جائے اور آنٹی ایملی اولڈ میڈز (old maids) کے اس ہوسٹل میں مزید نحوست برسانے کو زار و قطار روئیں۔

اگست کے اس شدید امس بھری شام کو جب بن برسے بادلوں نے دوپہر سے ہی اندھیرا کر رکھا تھا اور مختلف ٹھکانوں سے لوٹی ہوئی ورکنگ گرلز اپنے اپنے کمروں میں دبکی ہوئی ٹرانسسٹر سنتے ہوئے مونگ پھلیاں کھا رہی تھیں، زار و قطار روتی مظلوم ڈھول اڑاتی صورت والی آنٹی ایملی کے لئے میں نے بے پناہ محبت اور بے پناہ چڑ کو بیک وقت امنڈتے ہوئے محسوس کیا۔ محبت اس لئے کہ وہ محبت کی حقدار تھیں۔ معصوم، مخلص، نیک اور چڑ اس لئے کہ چالیس برس کی عمر کو پہونچتے پہونچتے بھی ان میں انسانوں کو پہچاننے کی تمیز نہیں پیدا ہو سکی تھی اور نہ ہی وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو سکی تھیں۔ لیکن کچھ لوگ شاید ایسے ہی ہوتے ہیں اور ان کا مداوا کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

تجھی کو کوئی کام دھام تو تھا نہیں بس ساری دنیا کی خبریں بٹورتی رہتی تھی۔ وہ تمہاری آنٹی ایملی آج کل نریش کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔

نریش کون؟ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

ارے وہی جوتے چپل والا مٹے منہہ۔

میں بڑے زور سے چونکی۔ ہلو اسیہ میں نریش کی باٹا کی بہت بڑی دوکان تھی۔ وہ ایک متمول سندھی گھرانے کا فرد تھا اور اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ مجھے یہ سب اس لئے معلوم تھا کہ بی اے میں نریش کی کزن پدما میری کلاس فیلو رہ چکی تھی۔ میں نے سوچا اب آنٹی کے لئے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

ہوسٹل کی ساٹھ سالہ تجربہ کار سکریٹری مس جیمز بڑی زبردست سماجی کارکن تھیں اور خصوصیت سے لکھنؤ کے کرسچین حلقوں کے متعلق بڑی باخبر رہا کرتی تھیں۔ موڈ میں آتیں تو بڑی چھبے دار اور دلچسپ گفتگو کرتیں۔ ایک دن ڈائننگ ٹیبل پر ایسا ہی موڈ بھانپ کر میں نے ان سے کہا کہ کوئی ایسا شخص بتائیں جس کے ساتھ آنٹی ایملی کو نتھی کیا جا سکے۔ یقیناً یہ بھی ایک زبردست سماجی خدمت ہوگی۔

اس سے کون شادی کرے گا؟ انھوں نے برجستہ کہا۔

کیوں مس جیمز؟

زبردست آوارہ ہے۔ کون نہیں جانتا اس کے بارے میں پوری کمیونٹی تھو تھو کرتی ہے۔ پرسوں مسز جوزف کہہ رہی تھیں چرچ والی میٹنگ میں کہ اب تمہاری آنٹی ایملی نے اتوار کو چرچ جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ جب فادر سلوانو تھے تب ......

انھوں نے کانٹے میں پھنسا مچھلی کا ٹکڑا منہ میں ڈالا اور نہایت نفاست سے منہ چلانے لگیں۔ میں نے ہار نہیں مانی۔

وہ جو ہیں ایک مسٹر ڈی سوزا ریٹائرڈ وے دوائیں بانٹنے میں آپ کی مدد کرنے آتے ہیں ۔۔۔ انھوں نے بات کاٹ دی۔

ڈی سوزا کی شادی میں کسی اچھی عورت سے کرواؤں گی۔ تم سمجھتی ہو ایملی گھر کرنے والی عورت ہے؟ خوب پٹی پڑھائی ہے اس نے تم کو ۔۔۔ ہاں یہ بتاؤ تم جیسی لڑکی اس قماش کے لوگوں سے کیسے مل جلتی ہے؟ سائیکالوجی پڑھ کر کچھ تمہاری اپنی چولیں ڈھیلی ہو گئی ہیں کیا؟ میں نے ہار مان لی اور خاموش ہو گئی۔

آنٹی ایملی آج کل ایک پرلے سرے کے بدقماش چھوکرے کے ساتھ گھومتی نظر آتی ہیں جو ان سے تقریباً دس برس چھوٹا ہے۔ انہیں قوی امید ہے کہ اپنی محبت اور خدمت سے وہ اُسے راہِ راست پر لے آئیں گی۔ میں اب ان سے ملتے ہوئے کچھ تھوڑا سا کترانے لگی ہوں۔ میری عمر مناسب ہے تجاوز کر رہی ہے اور میرے بوڑھے والدین بڑی شد و مد سے میرے لیے لڑکا تلاش کر رہے ہیں۔ لکھنؤ ایک ایسا شہر ہے جسے پرانی اقدار اب بھی عزیز ہیں ——— میں ڈرنے لگی ہوں ہو سکتا ہے لوگ آنٹی ایملی والا لیبل میرے اوپر بھی چسپاں کر دیں۔ آنٹی ایملی نے بغیر کسی رشتے ناطے کے ایک ذرا سی ہمدردی کے بدلے جو محبت مجھے دی ہے شاید اس کا بدل میں چکا دیتی مگر میں کیا کروں ——— اپنی تنہائی کو خدمتِ خلق اور وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے میں ڈبو دینے والی زمیندار گھرانے کی اکلوتی چشم و چراغ مس پونیا جمہز جن کے حلقۂ احباب میں اونچے درجے کے افسر اور دولت مند تاجر شامل ہیں۔ اپنے اونچے ستونوں سے جھانکتی ہیں اور آنٹی ایملی کو اس نئے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر انتہائی حقارت سے کہتی ہیں بچی آوارہ ہے ——— یہ گھر کرے گی بھلا!

اپنے شوہر و بچوں میں مگن تیجندر بیدی سے ذکر کرو تو "دُر فٹے منہ" کہہ کر اسٹریو کی آواز تیز کر دیتی ہے۔

○

نروان

طوطے کی چونچ جیسی ناک والا بڈھا جبر ڈس ابھی تک ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ تیز تیز گفتگو کے ساتھ کبھی کبھی قہقہوں کی آواز بھی اُبھرتی تھی اور جام و مینا کی کھنک بھی۔ بارہ بج رہے تھے اور ان لوگوں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ایک بجے کھانا شروع ہوگا اور دو بجے ختم۔ اٹھتے اٹھتے بھی باتیں باقی رہ جائیں گی جو کار کے پاس کھڑے ہو کر ہوں گی اور جب رتیش بیڈ روم میں آئے گا تو صبح کے تین بج رہے ہوں گے۔ گیتا کا جی چاہا کہ اس میں کسی جن بھوت کی روح حلول کر جائے اور وہ باہر جا کر ایک ایسا ہاتھ رسید کرے کہ ایک ہی ہاتھ میں وہ سارے کٹ گلاس کے جام رتیش، بوڑھے اور اس کے چمچوں کے ساتھ کہیں ہوا میں اڑ جائیں۔ منحوس صورت کہیں کے۔ مگر وہ سارے منحوس صورت انتہائی محویت کے ساتھ ایک بہت بڑے کاروباری معاملے کے نشیب و فراز طے کرنے میں مشغول تھے اور اس سے بھی زیادہ محویت کے ساتھ جام پر جام خالی کر رہے تھے۔ بڈھا ایک بڑی فیکٹری کا نمائندہ تھا جو ایک نیا صابن "لانچ" کر رہی تھی بہت سی دوسری فرموں کی طرح ان لوگوں نے بھی پبلسٹی کا کام نندی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو سونپا تھا۔ رتیش اس وقت ماڈل لڑکی کے انتخاب اور لوکیشن کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ فرم بہت بڑی تھی اور صابن کو بازار میں لانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کرنے کو تیار تھی۔ گیتا تیسری بار لاؤنج میں رکھے ہوئے پام کے بڑے بڑے پینٹل کے گملوں کے پاس سے گزری۔ اس نے جان بوجھ کر سینڈل کی ایڑیاں بجائیں تاکہ رتیش کو

اس کے گزرنے کا احساس ہو۔ بوڑھے کے حواریوں میں ایک بڑا اسمارٹ اور ہینڈسم شخص بھی تھا۔ قدموں کی تیز چاپ پر اس نے نظریں اٹھائیں اور بڑی خوش دلی سے پکارا ـــ اہا مسز نندی، گڈ ایوننگ، میں تو سمجھا آپ سو چکی ہوں گی۔

آواز کچھ مانوس سی تھی شاید اس سے کہیں تعارف ہو چکا تھا مگر گیتا گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ گڈ ایوننگ ـــ الو کا پٹھا! رتیش نے یقیناً اس کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھا ہوگا۔ یکایک اسے اپنی پشت پر چبھن کا احساس ہونے لگا۔ رتیش کا حکم تھا کہ جب باہر کاروباری لوگ بیٹھے ہوں تو گیتا ہرگز وہاں نہ جائے۔ وہ رتیش کے کچھ خاص نجی دوستوں اور عزیزوں کے سامنے ہی ڈرائنگ روم میں آ سکتی تھی لیکن ایسی صحبتیں شاذ و نادر ہی نصیب ہوتی تھیں جب دونوں میاں بیوی ساتھ بیٹھ سکیں۔ زیادہ تر وہ انہیں لوگوں میں گھرا رہتا تھا جنہیں وہ گیتا کے لئے قابل اعتراض قرار دیتا تھا۔ یوں تو ایسی محفلوں میں رات کے دو بجنا بھی عام بات تھی لیکن آج گیتا کو کچھ زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔ دس دن کی سخت ڈائٹنگ کے بعد اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہو گئے تھے۔ پھر پچھلے کئی مہینوں سے اس کے سر میں درد بیٹھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا "خالی وقت میں کچھ کیا کیجیے مسز نندی۔ اسپرین کی گولیاں کب تک کھلیئے گا؟" اور "کچھ کرنے" کے لئے اس نے پورے گھر کی سجاوٹ تبدیل کرا دی تھی۔ ہزاروں روپے صرف کرنے کے بعد وہ واقعی چند دن کے لئے سر کے درد کو بھول گئی تھی، مگر محض چند دن کے لئے۔ پھر خود اس کا اپنا جوش و خروش دودھ کے ابال کی طرح نیچے بیٹھ گیا تھا اور چند ہفتے بعد سارے شناسا لوگ بھی نئی سجاوٹ کو دیکھ کر اس کی تعریف کر چکے تھے، خالی پن کا پرانا احساس ابابیل کی طرح اس کے ذہن کے افق پر پھر چکرانے لگا تھا۔ اس کی عمر کی زیادہ تر لڑکیاں کنواری تھیں۔ بیاہتا عورتوں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ ہیروں میں غرق، لبوں میں سگرٹ دبائے، کارڈز ٹیبل پر جوا کھیلتی موٹی موٹی عورتیں اسے سخت ناپسند تھیں اور رتیش کے زیادہ تر دوستوں اور رشتے داروں کی بیویاں ایسی ہی تھیں۔ رہیں اس کی اپنی چار پانچ خاص سہیلیاں تو ان میں سے ایک کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور ان کے جینے کے

ڈھنگ اس قدر مختلف تھے کہ اب اِن کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ نینا اور پونم اپنے اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ کیا ہوا جو کچھ لوگ ان کے ذکر پر ناک بھوں چڑھاتے تھے (ناک چڑھانا اس وقت کچھ معنی رکھتا ہے جب 'صاحب معاملہ' پر اس کا اثر ہو) اور کیا ہوا جوان کے پیارے پیارے بچے نہیں تھے (یہ بچے بعض اوقات کیسے زہر لگتے ہیں) گُم ٹُم ماڈلنگ کرتی ہے۔ شیلا کو دو فلموں میں چھوٹے چھوٹے مگر جاندار رول مل گئے تھے۔ شاید اگلی بار سائڈ ہیروئن کا چانس مل جائے اور پھر کسی چھوٹے بجٹ والی فلم میں ہیروئن کا بھی۔ حال ہی میں اُس نے اروِن سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اگر وہ اروِن سے بندھی رہ جاتی تو اس کے کیریئر کا کیا ہوتا؟ دوسری فلم ملنے کے بعد وہ اروِن کے بنگلے سے نکل آئی تھی اور اپنا الگ فلیٹ لے لیا تھا۔ وہ سب آزاد تھیں خوش رنگ تتلیوں کی طرح۔ کسی شوہر نے ان کے پَر نہیں باندھے تھے۔ بوائے فرینڈ کا کیا ہے، ڈرائنگ روم کی سجاوٹ کی طرح جب چاہا بدل لیا۔ ان سب کی دلچسپیاں کتنی الگ تھیں اور زندگی کیسی جیٹ کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

اس نے اکسائی ہوئی نظریں دیوار گھڑی کی سنہری سوئیوں پر ڈالیں۔ بارہ بج کر پانچ منٹ۔ تاریخ بدل چکی تھی۔ دروازے پر کسی نے انتہائی مہذب انداز میں دستک دی۔ یہ اگنس تھی۔ ان کی آیا۔ "آپ کھانا کھا لیجئے میم صاحب۔ آپ کو ویسے بھی ساتھ نہیں کھانا ہے"۔

گیتا مشینی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاں ابھی یہ کام باقی تھا۔ کچھ وقت اسی میں گذر جائے گا۔ وہ کچن سے ملحق چھوٹے ڈائننگ روم میں چلی آئی۔ بریانی کی تیز خوشبو سارے میں چکراتی پھر رہی تھی "کم بخت مغل مر گئے۔ بریانی چھوڑ گئے۔ میرا بس چلے تو ہسٹری کی کتابوں سے ان کے باقی سارے تذکرے مٹا دوں۔ قورمہ، بریانی، تکے، چکن نورجہانی، کوفتے، موتی پلاؤ، مرغ مسلم، اہا ہا۔ کسی بھی قوم کو زندہ جاوید بنانے کے لئے بس یہ کھانے کافی ہیں۔ اس نے تیز تیز سانس لیتے ہوئے سوچا۔

ملازم اس کے سامنے بالائی اتارے ہوئے دودھ سے بنے پتلے نمکین دہی کا لمبا گلاس رکھ رہا تھا۔ ساتھ میں سلاد کی ایک چھوٹی پلیٹ تھی اور ابلی ہوئی مچھلی کا ایک بڑا ٹکڑا۔

اس کا جی اُبکائی لینے کو چاہا۔ رِنکی جب پیدا ہوئی تھی تو اسے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا لیکن بچے کو
کی پیدائش کے بعد اس کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ جب سے اس ذلیل فیشن میگزین کی ذلیل
کالم نگار نے اس کے بڑھتے ہوئے موٹاپے پر چوٹ کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ رتیش
۳۶-۲۵-۳۶ ناپ والی ایک زہریلی ماڈل میں غیر ضروری دلچسپی لینے لگا ہے تب سے
اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر کی نگرانی میں بڑی سخت ڈائٹنگ شروع کر دی تھی۔ ویسے اگلے مہینے
اس کو عورتوں کے ایک مقبول رسالے کے سرورق پر بھی آنا تھا اگر اس نے خیال نہیں رکھا تو وہ
خود بھی انہیں عورتوں کے زمرے میں شامل ہو جائے گی جن سے اسے سخت چڑ تھی۔ اپنے شوہروں
کی بڑی بھابی لگنے والی سست، بھدی، کاہل، موٹی عورتیں۔ اپنے مردوں کو دوسری اسمارٹ
عورتوں کے حوالے کرکے شراب، تاش، شاپنگ سے دل بہلاتی عورتیں۔ اس نے ایک جھرجھری
لی۔ ملازم بریانی اور دہی میں پکے مرغ کی قابیں لیکر بڑے ڈائننگ ہال کی طرف جا رہے تھے۔
مچھلی کا آخری ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاؤس وائف کے لئے کھانا کھاتے وقت
کم از کم پاس کھڑا ہونا ضروری ہے۔

صبح کو گیتا نے اپنی السائی ہوئی آنکھیں کھولیں تو بستر کے برابر میں تپائی پر رکھے
فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں ساڑھے نو بجا رہی تھیں۔ بستر دوسری طرف
شکن آلود تھا اور تکیے پر رتیش کے سر کا نشان تھا۔ یعنی رات کو وہ کمرے میں آیا تھا اور اس کے
پاس سویا بھی تھا۔ مگر کب کس وقت یہ اسے نہیں معلوم۔ دو بجے کے لگ بھگ اس کی نیند
شدت اختیار کر گئی تھی اور اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ بھوک اس پر حاوی
ہو کر اس کی قوتِ ارادی کو شکست دے دے، اس نے سو جانا ہی بہتر سمجھا۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ ایک انگڑائی لیکر اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

ہلو گیتا! میں رتیش بول رہا ہوں۔

جھنجھلاہٹ گیتا کی ریڑھ کی ہڈی میں رینگی اور سر سر کرتی اوپر چڑھنے لگی۔ "کہو"
"گیتا ڈارلنگ۔ ناراض نہ ہونا، میں نے تمہیں صبح جگایا نہیں۔ اس لئے کہ رات

کو تم بھی دیر سے سوئی تھیں۔ ایگنس نے میرا ضروری سامان پیک کرا دیا تھا۔ میں آفس سے ہی کھنڈالہ چلا جاؤں گا۔ وہاں مجھے اس رات والے پروجیکٹ کے لئے جگہ کا انتخاب کرنا ہے۔ واپسی کل کسی وقت ہوگی۔ ناراض تو نہیں ہونا؟ پرسوں تمہارے اور بچوں کے لئے ضرور وقت نکالوں گا۔" وہ ایک سانس میں جلدی جلدی کہہ گیا۔

جھنجھلاہٹ دھیرے دھیرے اندر ہی اندر کہیں جذب ہو کر غائب ہوگئی مگر پھر بھی کوئی مسرت نہیں جاگی۔ رتیش کے قرب کا کوئی احساس نہیں جاگا۔ اس نے خود کو گیلی مٹی کی طرح محسوس کیا جس کی اپنی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ "نہیں ــــ ناراض نہیں ہوں۔" یکایک اس کے اندر کی بیوی جاگی۔ "ایگنس نے سامان ٹھیک طرح پیک کر دیا تھا نا؟" پھر وہ دھیرے سے بولی۔ "وہ بھی جا رہی ہے کیا؟"

"وہ کون؟" رتیش کی آواز کی حیرت مصنوعی نہیں تھی۔

"وہی ــــ رما ائیر"

"Jealous cat" رمیش زور سے ہنسا۔ "نہیں وہ نہیں جا رہی ہے ــ اوکے۔ بائی بائی۔" اور ریسور پر بوسہ پھینک کر اس نے فون رکھ دیا۔

ناشتہ گیتا نے ماں جی کے ساتھ کیا۔ وہ ناشتہ ذرا دیر سے پوجا پاٹھ کے بعد کرتی تھیں اس لئے اکثر ان کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ پتا جی کب کے گزر چکے تھے۔ دوسرے ان کے زمانے میں مرد عورتوں کے فیگر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے نہ وہ اُن سے میگزین سجاتے تھے نہ دکانیں۔ اس وقت کے زیادہ تر مردوں کے لئے عورت صرف عورت تھی خواہ موٹی ہو یا ڈبلی، خوب صورت ہو یا بدصورت۔ اس لئے ماں جی جی بھر کر پھیل چکی تھیں۔ اس وقت بھی ان کے سامنے بالائی والا دہی رکھا ہوا تھا اور آلو بھرے پراٹھے، پھر میتھی سے بگھاری تلی ہوئی اردیاں اور بادام والی کھیر۔ گیتا کا جی جل کر خاک ہو گیا۔ حالانکہ اس کی ڈائٹنگ میں بے چاری ماں جی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی رہتی تھیں کہ بہو کچھ کھاتی نہیں ہے۔ گیتا نے کنکھیوں سے ان کے سامنے سجی جھجھاتی تھالی پر ایک نظر ڈالی پھر جھک کر ان کے پیر چھوئے۔ یہ ناٹک اسے روز کرنا پڑتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

احترام زیادہ ضروری ہے یا احترام کا دکھاوا۔

سیب کترتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ آج اور کل کے لئے وہ کیا پروگرام بنائے کہ دھڑدھڑاتی ہوئی شیلا اندر داخل ہوئی۔ وہ جہاں جاتی تھی اسی طرح شور مچاکر۔ اس نے گیتا کو نظر انداز کرتے ہوئے ماں جی کو مخاطب کیا۔

"ماں جی! میں گیتا کو لوٹا لیجانے کے لئے آئی ہوں۔ وہاں بابا پروت ناتھ آئے ہوئے ہیں۔ پتہ ہے نا آپ کو، مسز بڑجاتیہ کے یہاں پوتا انہیں کی دی ہوئی بھبھوت سے ہوا تھا۔ اب تیسرا چانس آپ کو نہیں کھونا ہے۔ چل گیتا اٹھ۔" اس نے ماں جی کی نظریں بچاکر آنکھ ماری۔

کیا چکر ہے؟ اپنے کمرے میں آکر ہنستے ہوئے گیتا نے پوچھا۔

کیوں؟ سارے شہر میں چپکے ہوئے پوسٹر نہیں دیکھے۔ موریہ کلب والوں نے زبردست بال (Ball) آرگنائز کیا ہے۔

اونہہ باسی خبر! گیتا اچانک کھسیاہٹ سے بھر اُٹھی۔ جب ممی پاپا اسے ساتھ نہیں لیجانا چاہتے تھے اس وقت ان پارٹیوں میں کیسی کشش ہوا کرتی تھی لیکن جس طرح ٹھونس ٹھونس کر کھا لینے کے بعد کھانے کے تصور سے ہی متلی آتی ہے۔ وہی کیفیت اب ڈانس پارٹیوں کے نام پر گیتا کی ہونے لگی تھی۔

باسی خبر کا تازہ حصہ یہ ہے گیتا ڈارلنگ کہ وہاں میرا ایک غیر ملکی دوست بھی چل رہا ہے اور اس نے کہیں سے 'بچھو' حاصل کئے ہیں۔

اونگھتی ہوئی گیتا اچانک چونکی ہوگئی۔ 'بچھو' اس نے صرف ایک بار پئے تھے اور دوبارہ پینے کی ہوس تھی۔ بچھو وہ خاص سگرٹ تھے جن کے دو کش لینے کے بعد آکاش پاتال گلے ملنے لگتے تھے۔ یہ اصطلاح گیتا کے قریبی سرکل کی مخصوص اصطلاح تھی۔ شاید اس لئے کہ پہلا کش بچھو کی طرح ڈنک مارتا تھا۔ "چلوں گی" اس نے مسکراکر کہا پھر بچھو کی خوشگوار یادوں میں کھو گئی۔ پہلے کش نے ضرور ڈنک مارا تھا لیکن اس کے بعد ہلکا ہلکا سرور ٹھنڈی پھوار کی طرح اعصاب پر برسا تھا۔ پورا کمرہ گلابی ہوا اٹھا تھا۔ اس میں ستارے ٹنک گئے تھے اور گیتا کا بدن ہلکا ہوکر اوپر اٹھتا چلا

گیا تھا وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بچھوؤں کے ساتھ ساتھ شیلا کے ہمراہ تنہا ڈرائیو کرنے، راستے بھر مونگ پھلیاں اور چاکلیٹ چباتے رہنے اور سڑک کے کنارے کے پنجابی ڈھابوں سے مٹر پنیر اور تندوری روٹی کھانے کا خیال بڑا فرحت انگیز تھا۔ جہنم میں جائے وہ میگزین اور اس کا کور فوٹوگراف۔ ایک دن کی بے پروائی سے کچھ نہیں ہونے کا۔ اس نے ائربیگ میں کچھ ضروری چیزیں ڈالیں اور ماں جی سے کہا "ہم لوگ جا رہے ہیں ماں رات کو شیلا کے ماما جی کے یہاں رکیں گے۔" یہ اجازت کم، اطلاع زیادہ تھی۔ جواب میں ماں جی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ بڑی ٹھنڈے مزاج والی عورت تھیں۔

باہر شیلا کی سفید فیئٹ کھڑی تھی اور گلابوں کے تختے میں رنکی ننھی سی کین کی باسکٹ لئے مالی سے گلاب کٹوا رہی تھی۔ اس نے دونوں کو نکلتے ہوئے دیکھا تو باسکٹ پھینک کر دوڑتی ہوئی آئی اور گیتا کے پیروں سے لپٹ گئی "ماما ہم بھی چلیں گے۔"

oh hell! گیتا بڑبڑائی۔ پھر غصہ پی کر بولی۔ "ہم رانی بیٹی کے لئے بہت سی چاکلیٹ لائیں گے اور گانا گانے والی گڑیا بھی۔"

مگر رنکی نے جملہ پورا نہیں ہونے دیا۔ وہ گیتا کی جینز کے پائنچے کھینچ کھینچ کر چلانے لگی تھی۔ ماما ہم بھی چلیں گے۔ ماما، ہمیں چھوڑ کر مت جائیے۔ ماما جی۔ ماما جی۔

گیتا نے اسے گود میں اٹھا کر بہلانا چاہا تو وہ اتنے زور سے گیتا کے گلے کی چین پکڑ کر جھول گئی کہ چین ٹوٹ گئی اور اس میں لٹکا ہوا ہیرے جڑا جگنو چھٹک کر دور جا پڑا۔ جگنو ڈھونڈنے میں گھنٹہ بھر لگ گیا۔ اس میں اکیس ۲۱ ہیرے تھے۔ پچھلے ہی مہینے رتیش نے اس کی ۲۱ ویں سالگرہ پر تحفے میں دیا تھا۔ گیتا مارے غصے کے فوں فوں کر رہی تھی۔ آیا روتی بچی کو اٹھا لے گئی۔ اس کے موٹے سرخ گالوں پر پڑے بڑے بڑے آنسوؤں کے قطرے گلابوں پر پڑی شبنم جیسے لگ رہے تھے۔

شیلا نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ دونوں کے منہ کا مزا کچھ کڑوا کڑوا سا ہو گیا تھا۔

گیتا تو نے شادی کیوں کی؟ اب تک تیرا شمار ملک کی ٹاپ ماڈلز میں ہوتا۔ فلمیں بھی

آفر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ دولت اور شہرت قدموں میں پڑی ہوتیں۔ ویسے دولت تو اب بھی بہت ہے اور کچھ کچھ شہرت بھی۔ لیکن یہ رہن رکھی ہوئی زندگی......؟

شیلا نے چہرے پر آئے ہوئے بال پیچھے پھینک کر اس سے وہ سوال کیا جو وہ ہر روز خود سے پوچھتی تھی۔

"شادی کیوں کی؟" گیتا نے سگرٹ سلگاتے ہوئے مدھم لہجے میں شیلا کا سوال دوہرایا۔ پھر ذرا رک کر بولی۔ "سچ بتانا شیلا اگر رو وڈوں میں کھیلنے والا اس قدر اسمارٹ، اس قدر ہینڈسم اس قدر مشہور لڑکا تجھے پروپوز کرتا تو تو انکار کر سکتی تھی؟ فلم اسٹار ستیش نندی کا بیٹا رتیش نندی۔ نندی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا اکلوتا وارث۔"

"میں تو فوراً انکار کر دیتی" شیلا نے اچانک بریک لگاتے ہوئے بات کاٹی۔ بھینسوں کی ریوڑ سے بھٹکتی ہوئی ایک بھینس عین سامنے آگئی تھی۔ کار ایک چرچراہٹ کے ساتھ رکی اور گیتا کا سر ونڈ اسکرین سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

یہ جھوٹ ہے۔ گیتا چڑ گئی۔ اس وقت تو شاید میں بھی انکار کر دیتی۔ لیکن سولہ برس کی عمر میں کسی کو اتنی عقل نہیں آتی۔

سولہ برس میں شادی کی خواہش بھی نہیں ہوتی۔ اس وقت تو لڑکیاں ہوا پر ناچتی ہیں، گلابی بادلوں پر تیرتی ہیں اور......

مگر اس وقت نہیں۔ اس بار گیتا نے بات کاٹی۔ جب رتیش نندی پروپوز کر دے۔ اس وقت آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، کان سو جاتے ہیں اور عقل پر کالے پردے کھنچ جاتے ہیں۔

شدید جھنجھلاہٹ اور نفرت کی واضح لکیروں نے شیلا کے چہرے کے نقوش بگاڑ دیے۔ "کیا نندی، نندی لگا رکھا ہے۔ وہی فیملی نا جس کے مرد دوسروں کی بہو بیٹیوں کو سر بازار ننگا کر دیتے ہیں اور اپنے گھر کی عورتوں کو سات پردوں میں ڈھک کر رکھتے ہیں۔

گیتا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کانٹوں بھرا کوڑا اس کے حواسوں پر شائیں سے گرا تھا۔ بات کتنی سچ تھی اور کتنی صاف۔ پانچ برس پہلے وہ سولہ برس کی ایک الھڑ لڑکی تھی

جو شوقیہ ماڈلنگ کرتے کرتے اچانک مشہور ہو گئی تھی۔ ایک شہر میں وہ ایک فلم پروڈیوسر کی نظروں میں آ گئی تھی اس کے انتہائی سخت گیر اور اصولوں کے پابند ڈیڈی کو اس پروڈیوسر نے شیشے میں اتار لیا تھا۔ پکچر شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی زبردست پبلسٹی شروع ہو گئی اور اسی وقت وہ رتیش کی نظروں میں آ گئی اس کی تازگی سے بھرپور حسن اور معصوم اچھوتے چہرے نے رتیش کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ رتیش جس کی عمر حسین عورتوں کے جھرمٹ میں گذری تھی اور گذر رہی تھی، اس کا ہاتھ مانگ بیٹھا اس نے اس پروڈیوسر سے مل کر اس کی پیشگی رقم واپس کر دی، پبلسٹی کا پورا خرچ واپس کر دیا، گیتا کی ساری تصویروں کے نیگیٹو خرید لئے اور گیتا کو اس بیک دمک سے متاثر کر لیا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ ان کی شادی کو پریس نے خاصی اہمیت دی تھی۔ اتنے سارے رسالوں نے ان کی تصویریں چھاپیں کہ گیتا کو ان کی گنتی بھی یاد نہ رہی۔ تصویریں تو اس کی یوں بھی چھپ رہی تھیں، لیکن ان نئی تصویروں کے ساتھ ایک اسٹیٹس جڑا ہوا تھا "مسز گیتا ناری" دو موٹی چوٹیوں میں سنوارے بالوں اور اسکول یونیفارم کی نیلی اسکرٹ کے ساتھ پنسل چباتی ہوئی الہڑ لڑکی اچانک ایک باوقار خاتون میں تبدیل ہو گئی تھی۔ بڑی باریکیوں اور تفصیل کے ساتھ بنا ہوا جدید ترین ہیر اسٹائل، فرنچ شفان کی سرسراتی ساڑیاں، قیمتی نگوں کے زیورات، ابتدا میں یہ امیج بڑی دلکش تھی۔ خود اپنا سراپا اس کے دل میں ہلکی سی گدگدی پیدا کرتا تھا مگر جلد ہی اس کے اندر کی شوخ و شنگ آزاد پرندے کی فطرت والی لڑکی اس امیج کے ساتھ چلتے چلتے تھک گئی۔ اس کا اندر کچھ اور تھا اور باہر کچھ اور۔

اس کے خیالوں کو پھر جھٹکا لگا۔ گاڑی ایک پنجابی ڈھابے کے سامنے رک رہی تھی اور تیز مصالحوں کی خوشبو نے ناک میں گدگدی کرنا شروع کر دی تھی۔

پارٹی تو تمام ڈانس پارٹیوں جیسی ہی تھی خوب جگ مگ کرتی مگر وہ ملٹری آفیسر کم بخت بڑا ہی ہینڈسم تھا۔ وجاہت سے زیادہ اس کے اندر ایک جنگلی پن تھا۔ ایک بے حد مہذب اور بڑے سلیقے سے اختیار کیا گیا جنگلی پن۔ اس کے جسم میں کسی شیر کی بو تھی اور ریچھ کی بدصورتی اور گینڈے کی طاقت، پھر بھی وہ وجیہہ تھا۔ ایسا وجیہہ کہ خود بخود اس کے بازوؤں میں سما جانے کو جی چاہے۔ بہت سی لڑکیاں اس کے آگے پیچھے گھوم رہی تھیں حالانکہ سب کے ساتھ ان کے

بولائے فرینڈز موجود تھے۔ کم نصیب شوہر والیاں بھی اس کی طرف ایک بار مڑ کر ضرور دیکھ لیتی تھیں لیکن وہ بغیر رُکے سیدھا گیتا کے پاس آیا اس نے سر کو قدرے خم کیا اور خالص فوجی انداز میں جھک کر اس سے رقص کی درخواست کی۔ گیتا فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

بینڈ بھی اس وقت کوئی جنگل کی ہی دُھن بجا رہا تھا۔ گیتا کو محسوس ہوا کہ کوئی اَن دیکھی طاقت اس پر مہربان تھی اسکےلئے جو چاہا مل گیا۔ وہ سارے کے سارے قصیدے جو لوگ اس کے حُسن کی شان میں پڑھتے تھے اُسے آج ہی سچ معلوم ہوئے۔ پھر انھوں نے وہ سارا وقت ڈانس کرتے ساتھ گزارا۔ وہ بہترین رقاص تھا۔ اس کے قدموں نے بہت جلد فاصلہ کم کر لیا اور گیتا نے اس کے کانوں کے قریب منہ لا کر سوال کیا "تم نے میرا نام نہیں پوچھا؟"

وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر دھیرے سے مسکرایا۔ "نام تو تمہیں میرا پوچھنا چاہئے تھا۔ تمہیں کون نہیں جانتا۔ تم گیتا نندی ہو۔ کچھ برس پہلے گیتا موہن ہوا کرتی تھیں۔ فلم اور فیشن میگزین تمہاری تصویروں سے بھرے ہوا کرتے تھے۔"

اب حیران ہونے کی اس کی باری تھی۔ اس لئے نہیں کہ ایک فوجی نے اسے پہچان لیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان مردوں میں سے ہو جو سوسائٹی اور فیشن میگزین پڑھنے کے شائق ہوتے ہیں۔ یہ رسالے اُسے ابھی تک بھولے نہیں تھے۔ حیران تو وہ اس لئے ہوئی تھی کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی اس کے پاس آیا تھا کہ وہ ایک بیوی ہے اور دو بچوں کی ماں۔ پھر ایسا ہی نہیں تھا بلکہ پچھلے چھ گھنٹوں سے اس کے ساتھ تھا۔ ڈانس، ڈرنکس، اسنیکس اور اتنی ساری مزے مزے کی باتیں۔ قہقہوں کی پھلجھڑیاں۔ سر در طاری کرنے کے لئے بچھوؤں کی قطعی ضرورت نہیں پڑتی۔

اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "تو تم مجھے جانتے ہو۔ پھر تم نے رقص کے لئے مجھے منتخب کیوں کیا؟" کم بخت ذہین بھی تھا۔ ایک سیدھے سوال کے ٹیڑھے معنی اس کی سمجھ میں جھٹ آ گئے اور وہ زور سے ہنس دیا۔ "میں فوجی ہوں اور فوجی خطروں میں کودنے کے شائق ہوتے ہیں۔"

دفعتاً وہ اس کے قریب آ گیا۔ گیتا نے اس کے چوڑے شانوں کا دباؤ محسوس کیا۔ ہلکے

سے اس کے لب گیتا کے لبوں سے مَس ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔ اسی وقت وہاں موجود بہت سے کیمروں میں سے کسی کیمرے کی آنکھ چمکی اور وہ بوسہ جو ہونے اور نہ ہونے کے درمیان تھا، سیاہ سیلولائڈ پر محفوظ ہو گیا۔

واپسی میں گیتا راستے بھر اس فوجی کے بارے میں سوچتی رہی۔ جیسے کسی ممکن دوا سے سر کا درد منٹوں میں اتر جاتا ہے اسی طرح اس کے قرب نے پچھلے پانچ برس کی ساری تھکن، ساری بوریت دور کر دی تھی۔ وہ بلا وجہ چہک رہی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو فون کرے گا۔ پل بھر کو گیتا کو رتیش کا خیال آیا۔ نہیں یہ رتیش کے ساتھ بے وفائی نہیں ہوگی۔ یہ تو محض دوستی ہے۔ ایسے دل چسپ، ایسے ہینڈسم مردوں کے مرد سے عشق کرنا یقیناً زندگی کا سب سے خوش گوار تجربہ ثابت ہوگا مگر۔ مگر۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ اچانک اس کے لبوں کا لمس اسے یاد آ گیا جو چوری کے گڑ کی طرح میٹھا تھا اور کسی ننھی خوبصورت چڑیا کے پروں کی طرح نرم اور گرم۔ وہ لمحہ اتنا مختصر نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ یا پھر کسی طرح دوبارہ لوٹ آتا۔ ہیرے کی کنی کی مانند لو دیتا ہوا وہ لمحہ اس نے اٹھا کر اپنے دل میں جڑ لیا۔

رتیش دوسرے دن کی جگہ چوتھے دن صبح کو لوٹا۔ گیتا کا وہ ہلکا پھلکا موڈ اب بھی برقرار تھا۔ اس کی جلد کے نیچے دمکتی مسرت کو رتیش نے بھی محسوس کیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ گیتا حسبِ معمول مُونہہ پھلائے ہوئے ہو گی اور اس کے ہاتھ آئیں گے دو چار طنزیہ جملے اور چند گرم گرم نظریں۔ مگر گیتا کو نارمل اور خوش دیکھ کر وہ خود بھی خوش ہو اٹھا۔ مسرت ایک برقی رَو کی طرح سارے گھر میں پھیل گئی۔ اس نے گھڑی دیکھ کر پورا نصف گھنٹہ رنکی کے ساتھ صَرف کیا اور پانچ منٹ تک چھ ماہ کی جیکو کو اچھالا۔ پینتالیس منٹ ماں کے پاس گزارے اور پھر گیتا کے ہونٹوں کا بوسہ لیکر اس سے وعدہ کیا کہ شام کو وہ اور گیتا طویل ڈرائیو کے لئے چلیں گے اور کھانا باہر کھائیں گے۔ دوپہر تک خراٹے مارنے کے بعد تین بجے وہ آفس چلا گیا۔ شام کو رتیش واپس آیا تو اس کا چہرہ انتہائی سنجیدہ تھا اور کسی اندرونی کیفیت سے تمتمایا ہوا۔

"گیتا" اس نے زور سے پکارا۔ آواز میں سختی تھی اور ہلکی سی لرزش۔ بالکل ویسی ہی لرزش

اس کے ہونٹوں کے گوشوں میں کھی تھی۔

گیتا بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے تازہ شیمپو کیے ہوئے بالوں نے اس کے چہرے کے گرد آبشار کی طرح ایک گھنی چادر گرا رکھی تھی اور چہرہ تازہ کھلے گلاب کی طرح ملائم اور روشن تھا مگر رتیش کی صورت دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں جلتے چراغ اچانک گل ہو گئے۔

"کیا بات ہے رتیش؟"

"اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ یہ۔ یہ" اور اس نے ایک بڑا سا لفافہ اس کی طرف پھینکا۔ وہ غصے سے ہکلانے لگا تھا۔ پھر اس نے بڑھ کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

گیتا نے کانپتی انگلیوں سے لفافہ کھولا۔ اس میں دو بڑی تصویریں تھیں۔ ایک میں وہ اس فوجی کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ دونوں بہت قریب تھے اور انداز بے حد والہانہ تھا۔ دوسری تصویر —— دوسری تصویر دیکھ کر گیتا خود سکتے میں آ گئی۔ مشاق ہاتھوں نے وہ لمحہ قید کر لیا تھا۔ وہی لمحہ جب اس کے گستاخ ایڈونچرس ہونٹ اس کے قریب آ گئے تھے۔ اس وقت وہ لمحہ کیسا مختصر تھا لیکن تصویر میں منجمد ہو کر زمان و مکان کو ہمیشہ کے لیے اسیر کر گیا تھا۔

"یہ —— یہ میں پونا گئی تھی شیلا کے ساتھ۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ آج شام کو تم سے ......"

"کب سے جانتی ہو اسے؟" رتیش بات کاٹ کر دہاڑا۔

"صرف اسی دن ملاقات ہوئی تھی۔ رتیش ہوش میں آؤ۔ یہ تصویریں تمہیں ملیں کہاں سے؟" پل کے پل گیتا کو خیال آیا کہ کہیں وہ شخص اسے کسی جال میں تو نہیں پھنسانا چاہ رہا تھا۔

"صرف اسی دن ملاقات ہوئی تھی" رتیش نے اس کے لہجے کی نقل اتاری۔ "بہت خوب! اسی لیے تو نوبت صرف یہاں تک پہونچی۔ چند ملاقاتوں کے بعد اس کی خواب گاہ میں گھس جانا"

"رتیش!" گیتا غصے میں کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اگر یہ تصویریں چھپ جائیں تو؟" رتیش نے اس کے غصے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ "خیریت ہوئی کہ یہ رویندر کے کیمرے میں تھیں۔ آج اس نے پروف بنانے تو میرے پاس بھجوا دیں۔"

اوہ! گیتا نے ٹھنڈی سانس لی۔ تو وہ بلیک میلر نہیں تھا۔

"آئندہ تم میرے بغیر کسی ڈانس پارٹی میں نہیں جاؤگی۔ آؤٹ آف اسٹیشن بھی تنہا نہیں جاؤگی اور آج سے تمہاری لفنگی سہیلیوں کا داخلہ اس گھر میں بند۔ یہ شریف آدمی کا گھر ہے سمجھ گئیں؟" وہ پھر دہاڑا۔ پھر اس نے پرنٹ اور نیگیٹو دونوں کے ٹکڑے ٹکڑے کئے اور آندھی طوفان کی طرح کمرے سے باہر نکل گیا۔

شام برباد ہو چکی تھی اور شاید آئندہ آنے والے کئی اور دن بھی۔ رتیش سے پہلے بھی کئی مرتبہ جھگڑے ہوئے تھے اور وہ روئی بھی تھی لیکن آج کی بے عزتی نے اسے گنگ کر دیا تھا۔ تصویریں دیکھ کر وہ کچھ شرمندہ بھی ہو گئی تھی لیکن رتیش نے اتنے سخت الفاظ کیوں استعمال کئے؟ اب تک اسے یہ معلوم ہو جانا چاہئے تھا کہ کم از کم وہ آوارہ نہیں ہے اور شوہر سے محبت کرتی ہے۔ "تمہاری لفنگی سہیلیوں کا داخلہ آج سے اس گھر میں بند۔ یہ شریف آدمی کا گھر ہے۔" یقیناً یہ شریف آدمی کا گھر ہے۔ شادی سے پہلے وہ ایک لڑکی کے ساتھ پورے پانچ برس یوں ہی رہتا چلا آیا تھا۔ پھر اسے انگوٹھا دکھا کر گیتا سے شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد بھی اس نے تین معرکے کے عشق لڑائے تھے اور تینوں گیتا کے علم میں تھے۔ عورت رتیش کے لہو میں شامل تھی۔

رتیش کے شادی کے فوری بعد والے عشق سے گیتا بہت اپ سٹ ہو گئی تھی تو بڑی مسز نندا یعنی اس کی ساس نے بلا کر اس سے کہا تھا۔ "بہو۔ تمہیں معلوم ہے مجھے چھینے کی مٹھائیاں بنانے میں مہارت تھی۔ تمہارے سسر کے لئے میں ہمیشہ اپنے ہاتھ سے بناتی تھی۔ تمہارے سسر کی ایک داشتہ تھی۔" گیتا کی سمجھ میں داشتہ اور چھینے کی مٹھائی کا تعلق نہیں آیا۔ لیکن مسز نندا کا لہجہ اتنا ٹھہرا ہوا اور پرسکون تھا کہ اس کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی اور اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ انھوں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"تم جانو بیٹی۔ ان دنوں شریف گھرانوں کی لڑکیاں یوں دوسرے مردوں کے ساتھ نہیں رہا کرتی تھیں۔ بس طوائفیں ہی دستیاب تھیں کم نصیبوں کو۔ ہاں تو وہ آ کر رہا کرتی تھی یہاں۔ بنارس کی تھی۔ تمہارے سسر مجھے مجبور کرتے تھے کہ میں اپنے ہاتھ سے سندیش اور "رس گلے" بناؤں۔ اس کی خاطر کروں۔ زندگی یوں ہی گزر گئی طوائفوں کو سندیش کھلاتے کھلاتے۔ کچھ کہتی تو کہتے: تم پوجا کی تھالی میں پڑا ہوا پھول ہو اور وہ روندے سونگھے جانے والے پھول تمہارا اور اُن کا کچھ مقابلہ ہے؟"

گیتا سن سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جیسے کوئی ننھا بچہ دادی ماں سے پریوں کی کہانی سن رہا ہو۔ اس کی ساس نے بات جاری رکھی۔ "تو بہو شکر کرو کہ رتیش کسی کو گھر میں نہیں لاتا کہ تمہیں اُس کے لیے سندیش بنانے پڑیں۔ آج کل کی پڑھی لکھی اسمارٹ لڑکی ہو۔ تمہارے ہاتھوں نے شوہر کی نگامیں زیادہ مضبوطی سے پکڑ رکھی ہیں۔ جاؤ اور خوش رہو۔ یہ سب عارضی چیزیں ہیں۔ تم پوجا کی تھالی میں پڑا ہوا پھول ہو بہو۔" انھوں نے اپنے مرحوم شوہر کے الفاظ دہرائے اور اس کی بیک لیس (Back less) چولی سے جھانکتی گوری، سڈول، ننگی پشت پر اپنا شفیق ہاتھ رکھ دیا۔ پل بھر کو ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر اُبھرا۔ یہ لباس ان کے نزدیک غیر شریفانہ تھا مگر پھر وہ پرسکون ہو گئیں۔

مسرت کی طرح شرافت بھی کتنا اضافی لفظ ہے۔ بے چاری ماں جی! گیتا نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ذہن بالکل خالی تھا اور آنکھوں میں کوئی چیز ڈنک مار رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیے۔

سامنے نناری مینشن کے وسیع و عریض لان پھیلے ہوئے تھے جن کی مخملی گھاس مشہور تھی اور جہاں کے گلاب ہر سال انعام لیتے تھے۔ الماریوں میں ہندوستانی سلک کی ساریاں اور یوروپ و امریکہ کے بازاروں کے بہترین کپڑے ٹھنسے پڑے تھے، ڈریسنگ ٹیبل پر فرانسیسی خوشبوئیں ماری ماری پھرتی تھیں۔ نرسری میں اسی طرح کے دو بچے سجے ہوئے تھے جیسے نندی ایڈورٹائزنگ ایجنسی بے بی فوڈ کے اشتہاروں میں دکھاتی تھی۔ گلابی اور موٹے اور پیارے

مگر یہ دنیا بڑی واہیات تھی - بڑی بے کیف، بڑی اُداس اور یہاں کرنے کو کچھ نہیں تھا ہر چیز نری تھی - پلاسٹک، فارن ٹریپ، زیور، کپڑے، نوادرات، جواہرات، شوہر، عاشق، بچے -

بچوں پر اسے رِنکی یاد آ گئی - اس دن ساتھ چلنے کے لئے کیسا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی - بہت دن سے وہ اسے کہیں لے بھی نہیں گئی ہے - یوں آیا کے ساتھ رِنکی روز ہوا خوری کو جاتی ہے اور پچھلے مہینے رتیش اسے شاپنگ اور تفریح کے لئے بھی ساتھ لے گیا تھا مگر اس دن گیتا کو چندن بیوٹی پارلر کا افتتاح کرنا تھا اور وہ ساتھ نہیں گئی تھی - اچانک شدید ندامت اُسے سانپ کی طرح ڈسنے لگی - اس نے نرسری کے لئے انٹرکوم کا بٹن دبایا - وہاں کوئی نہیں تھا - شاید آیا بچوں کو لیکر پارک گئی ہوئی تھی - وہ باہر آ گئی - پارک گھر کے قریب ہی تھا - اس نے مان سنگھ ڈرائیور کو رِنکی کو لانے کے لئے بھیج دیا اور خود گاڑی کی چابیاں سنبھالتی گیراج کی طرف بڑھ گئی - مان سنگھ پورے نصف گھنٹے کے بعد لوٹا - اتنے دیر میں وہ غصے پیچ و تاب کھا چکی تھی - اب جو منظر نظر آیا اس سے اس کا پارہ تھرما میٹر توڑ کر باہر آ گیا - رِنکی چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور مان سنگھ کی لمبی لمبی مونچھیں پکڑ کر کھینچ رہی تھی - اس کا گندمی چہرہ تکلیف سے سرخ ہو گیا تھا -

" اٹھا کے پٹخ دو بیہودہ کو - بالکل قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے " گیتا چیخی -

رِنکی اور زور زور سے چلّانے لگی - تب ہی گیتا کو یاد آیا ایک بار رِنکی کی ٹیچر نے کہا تھا کہ بچے کو غصّہ دلانے سے احتراز کرنا چاہیئے - اس نے یہ اصول یاد کیا اور اپنا غصّہ ضبط کر کے بولی " کیوں روتی ہے بٹیا رانی - آؤ چلو ہم لوگ گولڈن ایگل چل رہے ہیں - بٹیا رانی کو تلے ہوئے جھینگے بہت پسند ہیں اور پھر کولڈ کافی آئسکریم کے ساتھ -

ممم - ممم ......

رِنکی نے اس بار اپنا موٹا پاؤں کراٹے اسٹائل میں گیتا کے منھ پر مارنا چاہا جو اسے مان سنگھ کی گود سے اتارنے کے لئے آگے بڑھ رہی تھی - وار بچا کر گیتا نے دانت پیسے - " باہر چلنا ہے ؟ "

"بے بی ناراض ہیں میم صاحب۔ وہاں جھولا جھول رہی تھیں۔ آنے کو تیار نہیں تھیں۔ آپ کا حکم تھا اس لئے گود میں بھر کر اٹھا لایا۔" مان سنگھ نے وضاحت کی۔

"اسے گاڑی میں ڈال دو۔" رنکی کی ٹیچر نے کہا تھا ماں کو بچے کو تھوڑا ٹائم ضرور دینا چاہئے۔ رنکی کی ٹیچر نے سوئٹزرلینڈ میں نرسری ٹریننگ لی تھی اور وہ اسکول ایڈوائزر بھی تھی۔

مان سنگھ گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ رنکی لاتیں چلاتے ہوئے برابر ٹیپ کی طرح بج رہی تھی۔ "ہم نہیں جائیں گے۔ ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہم تو جھولا جھولیں گے۔" اس نے گیتا کی ساڑی کے اڑتے ہوئے آنچل پر جھپٹا مارا۔

"جہنم میں جاؤ۔" گیتا پھر زور سے چیخی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اس نے رنکی کو ایک دھکا دیا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

رنکی اب مان سنگھ کے شانوں پر سر رکھے ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ اسے لیکر پارک کی طرف چلا گیا۔ وہاں انگیس تھی اور پرام میں جیکو بڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ انگیس نے یوڈی کولون میں بھیگا پیپر نیپکن نکال کر رنکی کا منہ پونچھا اور اس کی ننھی سی انگلی پکڑ کر اسے جھولے پر بٹھا دیا۔ رنکی کی معصوم کھلکھلاہٹ پارک میں گونج اٹھی۔

گولڈن انگل کی سنہری سجاوٹ اور وہاں کے سنہرے لوگ، سب جیسے گیتا کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ ایک خالی پن اس کے چاروں طرف بھنگوں کے جھنڈ کی طرح ناچ رہا تھا زوں زوں۔ زوں۔ اور یہ زوں زوں اس کے اعصاب پر قطرہ قطرہ پانی کی طرح ٹپک رہی تھی۔ رنکی بھی ساتھ چلی آتی تو ایسا لگتا کہ آس پاس کوئی ہے۔ رنکی کے خیال سے اس کے اعصاب میں پھر تناؤ پیدا ہونے لگا اور دانت خود بخود بھنچ گئے۔

سنا ہے کچھ لوگ بچوں کے لئے دعا تعویز کراتے ہیں۔ ڈاکٹروں سے لیکر ملا سیانوں تک ہزاروں روپئے خرچ کرتے ہیں۔ کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ اور وہ عورتیں کیسے زندہ رہتی ہیں جن کے بچوں کو پالنے کے لئے آیائیں نہیں ہوتیں۔ پاگل کیوں نہیں ہو جاتیں

وہ ؟ اس کے ملنے والوں میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جس کے بچوں کے لیے آیا نہ ہو۔ وہ کس سے پوچھتی کہ تم زندہ کیوں ہو اور اگر زندہ ہو تو پاگل کیوں نہیں ہو۔

اس نے زندگی کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بار کے سامنے لوگ پی رہے تھے۔ ایک حسین غیر ملکی جوڑا دوسروں کی موجودگی سے بے نیاز اپنے آپ میں کھویا ہوا تھا۔ ایک سانولی لڑکی اپنے سانولے محبوب کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی اور ایک ٹیبل پر کوئی سیٹھ جی تھے۔ بے حد موٹی مگر خوشی کے کھلی پڑتی ہوئی ان کی بیوی ان کے ساتھ تھی اور ایک پھول سی جوان ہوتی ہوئی لڑکی۔ تینوں مزے لے لیکر چائنیز کھانے کھا رہے تھے۔ گیتا کا جی چاہا کہ وہ بیرے سے ایک ڈرائی مارٹینی کے لیے کہے لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ رتیش کے کسی چمچے یا کسی ذلیل سے کالم نگار نے اسے تنہا شراب سے شغل کرتے دیکھ لیا تو ؟ اس نے محض اسنیکس اور کافی پر اکتفا کرنے کی سوچی ۔۔۔

تلے ہوئے جھینگوں میں کپڑے کا مزہ تھا اور مومو (MOMO) مٹی جیسے لگ رہے تھے۔ اس نے کانٹا اور پلیٹ سرکا دیے اور خالی خالی آنکھوں سے خلاءمیں دیکھتے ہوئے کافی میں چمچہ چلانے لگی۔ گولڈن ایگل میں ساری کٹلری اور کافی پاٹ چاندی کے تھے جن پر سنہری پالش تھی۔ ہوٹل اپنی پرتعیش سجاوٹ اور مہنگے مگر لذیذ چینی کھانوں کے لیے مشہور تھا۔

گیتا کو اچانک خیال آیا کہ اگر وہ اس چمچے کو اپنے پرس میں رکھ لے تو۔ سانپ کی کھال سے بنا گیتا کا وہ پرس اس چمچے سے زیادہ قیمتی تھا۔ اس سے بھی قیمتی اس کے سینڈل تھے۔ سینڈل سے قیمتی ساڑی اور ساڑی سے قیمتی کانوں کے زیور میں جڑے دسیوں ہیروں کا صرف ایک ہیرا۔ چاندی کا وہ حقیر اور کم قیمت چمچہ گیتا کے لیے ایسا تھا جیسے سمندر میں چلّو بھر پانی۔ مگر اس کو چرانے کے خیال سے اس کے سارے جسم میں ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ مسرت بھرے ہیجان کی ایک لہر سمندر میں آتے جوار کی طرح کی سارے ماحول پر حاوی ہو گئی۔ بھرے ریسٹورانٹ میں چمچے کو پرس میں ڈال لینا ایک چیلنج تھا۔ اس کا ذہن سوتے سوتے انگڑائی لیکر جاگ اٹھا اور اس نے یہ چیلنج کو قبول کر لیا۔

چاروں طرف بہت سے لوگ تھے۔ سنہری اور سفید وردی میں ملبوس بیرے مسلسل آجا رہے تھے۔ گیتا بہت دیر تک بے چینی سے پہلو بدلتی رہی اور اس تمام وقفے میں ایک میٹھی میٹھی گدگدی اس کے وجود میں دوڑتی چلی گئی جیسے چمچہ ہلانے سے کافی میں مٹھاس دوڑ رہی تھی۔ اس نے پیالی موہنہ کے قریب کی پھر نیچے رکھا اپنا پرس کھولا اور اس کا منہ کھول کر قریب کر لیا۔ چمچہ انگلیوں میں پکڑ کر اس نے ہوشیاری سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ پھر پرس کی آڑ میں چمچہ قریب لائی۔ اس نے اپنا چہرہ نیچے جھکایا۔ نیچے۔ بہت نیچے۔ جیسے جھک کر کچھ دیکھ رہی ہو۔ پھر پرس کی حفاظتی دیوار کے پیچھے سے چمچہ گریبان کے اندر ڈال لیا۔

رگوں کا خون اچھلتا، کودتا تیزی سے گردش کرتا کنپٹیوں پر تھپیڑ مارنے لگا۔ وہ لمحہ، وہ لمحہ مکمل خاموشی کا لمحہ تھا۔ بھرپور کامیابی کا لمحہ۔ اس بھرے مجمع کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اس کے چیلنج کا جواب دینے کا لمحہ۔ آج تک اس نے اتنا بڑا معرکہ کبھی سر نہیں کیا تھا۔ زندگی کی باقی ساری مسرتیں، ساری کامیابیاں خود سے چل کر اس کے پاس آگئی تھیں۔ مگر یہ جوکھم۔ یہی رومانس ہے، یہی حرکت ہے، یہی خوشی ہے۔ وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے کاؤنٹر کی طرف بڑھی کہ کہیں بیرا آکر چمچے کی عدم موجودگی کو محسوس نہ کر لے۔ اس نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور بیرے کے لئے معقول رقم چھوڑ کر اسے دے جانے کی ہدایت کی۔ ابھی ایڈونچر کا عنصر باقی تھا۔ ابھی وہ ریستوراں کی حدود میں تھی۔

جلدی جلدی وہ گاڑی میں بیٹھی۔ گاڑی حرکت میں آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے گریبان چھوا۔ چاندی کا کافی اسپون چبھ رہا تھا۔ اس نے نکال کر دیکھا جیسے یقین نہ آرہا ہو کہ یہ کارنامہ اسی نے انجام دیا ہے۔ خوشی پھر اندر ہی اندر پھوٹ پڑی۔ گاڑی اب ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ رکی۔ اس نے چمچہ نکالا۔ اسے بوسہ دیا اور پوری قوت سے گھما کر سمندر میں پھینک دیا۔

کل کسی دوسرے پوش ریستوراں میں جائے گی کسی اور معروف اور بڑی دوکان میں۔ وہاں بھی کچھ ہاتھ آ ہی جائے گا۔ موزے، دستانے، لپ اسٹک، کوئی چھوٹی موٹی سجاوٹ کی چیز —— جینے کا راز اس نے پا لیا تھا۔ ماں جی، رتیش، رنکی، چیکو، پریس، دنیا —— سب کی ایسی کی تیسی۔ وہ خود اپنی ذات میں مکمل ہے۔ بالکل مکمل اور بالکل مطمئن۔

○

وہ ایک صبح

مسز ریکھا میر چندانی !

لانبا، مضبوط گٹھا ہوا بدن، چمکیلی سیاہ رنگت، آنکھوں میں چبھنے والے گہرے زرد رنگ کے کسی بے حد سستے کپڑے کی دھوتی پہنے وہ پوچا برتن کرنے والی عورت چوتھی منزل سے بڑبڑاتی ہوئی اتر رہی تھی۔ ریلنگ پر جھکی ہوئی ریکھا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس عورت کے چہرے کی سیاہی میں تلخی اور استہزا کا کچھ ایسا امتزاج تھا کہ ریکھا پاس کھڑے شوہر سے سبب پوچھنے پر مجبور ہو گئی " یہ کیا کہہ رہی ہے انوپ ؟ " بہار کی مقامی dialect اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

انوپ ہنس پڑا۔ یہ کہہ رہی تھی ذرا آج ان صاحب لوگوں کو بھی تو مزہ ملے گرمی کا۔

ریکھا کے جھنجھلائے ہوئے چہرے پر لمحہ بھر کو حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ پھر وہ بھی ہنس پڑی۔ یقیناً کسی صاحب سے جھگڑا ہوا ہوگا اس کا۔

رات سے بجلی غائب تھی۔ ساری رات ریکھا اور انوپ بیٹھے مچھر مارتے اور پنکھا جھلتے رہے۔ تھکے پھر بھی نیچے بے چین سے تھے۔ کبھی اس کروٹ تو کبھی اس کروٹ۔ صبح ہونے پر مچھر غائب ہوئے اور کچھ ٹھنڈی ہوا چلی تو ذرا کی ذرا نیند آئی لیکن اجالا ہو جانے کے بعد بھلا کوئی کتنا سوئے۔ پھر وہ کمبخت نیپالی ملازم چھوکرا۔ آج اس کی فرض شناسی بری طرح کھل گئی۔۔۔ جی بھر نا کیسا، آنکھ لگی بھی نہ تھی کہ بیڈ روم کے دروازے پر دستک ہوئی " چائے صاحب !" جھنجھلاتے ہوئے ریکھا نے دروازہ کھولا تو چائے کے ساتھ اس نے خوش خبری سنائی۔

"میم صاحب - پانی بند ہو گیا - بجلی نہ آنے کی وجہ سے پمپ نہیں چل رہا -- رات کا اسٹور کیا ہوا پانی نلوں میں آ رہا تھا وہ ختم ہوا تو نل چلنے بند ہو گئے - وہ تو کہیے صاحب میں نے سویرے اٹھ کر چائے بنائی اور پانی کی دھار پتلی ہوتی ہوئی دیکھی تو ایک بالٹی بھی بھر لی - بابا لوگوں کو ہاتھ روم جانے کے لیے ضرورت ہو گی" - اس نے داد طلب نظروں سے ریکھا کی طرف دیکھا مگر وہ جھنجھلائی ہوئی مونہہ پھلائے بیٹھی رہی - آنکھوں میں بھِڑوں نے ڈنک مار رکھے تھے اور دماغ میں بچھو رینگ رہے تھے - سارا بدن پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس نے مٹھیاں باندھ کر اے بیتا سیلنگ فین کی طرف دیکھا - جی چاہا مار مار کر اس کے پرزے اُڑا دے - اندر بہتا ہوا لاوا باہر آئے تو شاید یہ کمان جیسا تنا ہوا بدن کچھ ڈھیلا پڑے - مگر ریکھا مہذب اور نارمل دنیا کی ایک فرد تھی اس دنیا میں اندر کا لاوا سدا اندر کی طرف بہتا ہے اور چاٹ چاٹ کر لوگوں کو گھن کھائے گیہوں کی شکل میں تبدیل کرتا رہتا ہے - اوپر سے گول رسیلا دانہ لیکن چھو دیجیے تو پیٹ سے ٹوٹ جائے -

آج ریکھا کا جی بھی پیٹ سے ٹوٹ جانے کو چاہ رہا تھا -

ابھی صرف ۲۲ تاریخ تھی اور گنتی کے چند نوٹ اس کے ہاتھ میں رہ گئے تھے - اس مختصر سی گنتی کو وہ مہینے کے باقی دنوں سے تقسیم کر رہی تھی کہ کپڑے لیکر مالتی آ گئی تھی - اس کی نظریں ریکھا کے پرس پر گڑی رہ گئی تھیں - تھوک نگلتے ہوئے بولی - میم صاحب دس روپے پیشگی مل جاتے تو -- ریکھا کا جی جل کر خاک ہو گیا - نا ہنجار بدبخت - روپیوں پر نظر پڑ گئی تو پیشگی ضرورت نکل آئی لیکن دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ مالتی اپنی محنت کا پیسہ مانگ رہی تھی - اس کے حساب میں یقیناً دس سے کہیں زیادہ روپے جمع ہو چکے ہوں گے پھر دینا بھی انہیں دو ہزار روپیوں میں سے ہے جو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اس کے مونہہ پر دو ہزار جوتوں کی طرح پڑتے ہیں -

جھنجھلاتے ہوئے دس کا ایک نوٹ اس نے مالتی کی طرف تقریباً پھینک دیا -

مالتی کہہ رہی تھی ---- میم صاحب، کچھ باسی واسی بچا ہو تو ...... بچے نے صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے دس بج رہے ہیں -

رکھیا نے دوبارہ حساب جوڑنے کے عمل کو درمیان سے توڑ دیا۔ بعض اوقات معمولی سا حساب کتنا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

بچے تو چھ عدد پیدا کر لو۔ کھلانے کو ہو یا نہ ہو۔ مرد کے سامنے ٹانگیں پسار کر لیٹ جاتے وقت یہ خیال نہیں رہتا کہ تیرے میرے گھر سے مانگ کر کس کس کا پیٹ بھرے گا۔ رکھیا نے دل ہی دل میں سوچا لیکن مالتی کو کوئی جواب نہ دیکر اس نے انندو کو پکارا۔ ارے انندو ذرا وہ ٹوسٹ دے جانا جو مِلی کھاتے کھاتے چھوڑ گیا تھا۔

ٹوسٹ پر تھوڑی سی جیلی بھی لگی ہوئی تھی۔ مالتی کے مدقوق، فاقہ زدہ بچے کے چہرے پر کمزور سی خوشی برسات کی مریل دھوپ کی طرح پھیل گئی۔

ـــــ رکھیا کے چہرے پر پسینہ دھار بن کر بہہ رہا تھا۔ ارے بھگوان سنکٹ موچن بتی کب آئے گی۔ ساری رات گذر چکی۔ نیچے کوئی شخص گندی سی گالی بکتا ہوا جا رہا تھا۔ بجلی ڈیپارٹمنٹ کی تو ...... اور رکھیا کو احساس ہوا کہ سنکٹ موچن سے بجلی بھیجنے کی درخواست کرنے کی بجائے الیکٹرسٹی ڈیپارٹمنٹ کے سارے انجینئروں کو ماں بہن کی گالیاں دینے میں زیادہ ذہنی سکون کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا ذہن اس گندی گالی کی تکرار کرنے لگا۔

اچانک وہ ڈر گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پاس کھڑا انوپ اس کے خیالوں کو پڑھ رہا ہے۔ وہ گندی گالی مجسم آواز بن کر سب کو سنائی پڑ گئی ہے۔ انتہائی مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ کلاس ون گزیٹیڈ آفیسر کی مہذب تعلیم یافتہ بیوی کے ذہن میں انگڑائیاں لیتی ہوئی یہ گالی۔ رکھیا نے گھبرا کر چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے باسیوں کے سارے نوکر سر پر پانی کے برتن اٹھائے چلے آرہے تھے۔ سڑک پر لگے نل کے پاس بھیڑ تھی۔ صبح کا وقت، آفس اور اسکول جانے کا وقت اور گھروں میں پانی کا قطرہ نہیں ـــــ دور کہیں بلڈنگ کا چوکیدار کھڑا کہہ رہا تھا ـــــ "ابھی شاید دو گھنٹے لگیں گے"

"ہاں کہیں کوئی میجر بریک ڈاؤن ہوا ہے" کسی شخص نے لقمہ دیا۔

"ارے گورنمنٹ۔ ای۔ کے بریک ڈاؤن ہوئی چلا۔ مسٹر بجلی بتی کا کون پوچھے"
پان کی دوکان پر کھڑے ٹرانسسٹر سنتے ہوئے لوگوں میں سے ایک پکارا اور باقی سب بھدا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

اخبار والا اخبار ڈال کر چلا گیا تھا۔ انوپ ندیدوں کی طرح کوری ڈور سے دروازے کی طرف جھپٹا۔ کم از کم گھنٹہ بھر کی چھٹی۔ اب اسے نہ گرمی لگے گی نہ آنکھوں میں جلن کا احساس ہوگا۔ اخبار اٹھا کر وہ بڑے آرام سے باتھ روم میں گھس جائے گا۔ پھر پیٹتے رہیے دروازہ۔ یہ نہ جانے کون سی عادت ہے باتھ روم میں اخبار پڑھنے کی۔ فرائڈ نے اپنی کس کتاب میں اس کا تجزیہ کیا ہے۔

"ملکینی۔ ذرا ہٹیے گا" نیچے کے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے والا ایک جوان سا آدمی جو شاید سائیکل بنانے کا کام کرتا تھا اوپر کسی شخص کا پانی پہونچانے جا رہا تھا۔ کوری ڈور کے آخر میں زینے کے تنگ موڑ کو ریکھا کے جسم نے یوں بھر دیا تھا کہ اس آدمی کو چھلکتی ہوئی بالٹی نکالنے میں دقت ہو رہی تھی۔ ریکھا مشینی انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ اوپر چڑھتے ہوئے وہ آدمی بڑبڑا رہا تھا "میم صاحب لوگوں کو کام تو رہتا نہیں۔ سبیرے سبیرے آکر باہر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ دو بالشت کا تو گلیارا ہے"

ریکھا دل ہی دل میں کٹ گئی۔ گھر ذرا ڈھنگ کا ہوتا تو وہ یوں باہر آکر کیوں کھڑی ہوتی۔ اور بھلا ان دو ٹکے کے لوگوں کی مجال ہوتی کہ وہ آوازے کسیں۔ دیا سلائی کی ڈبیا جیسا فلیٹ، کل جمع دو کمرے، ننھا سا کچن، انتہائی پتلی شیطان کی آنت جیسی مشترکہ کاری ڈور۔ بجلی آئے دن غائب اور گرمی ایسی کہ پنکھے کے بغیر سانس لینا مشکل۔ اس کے پاپا بھی انوپ کی ہی رینک کے آفیسر تھے لیکن کیسا بڑا سا بنگلہ ملا ہوا تھا ان کو۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور گردن نیچے نیوڑھائی۔

عین نیچے والے گیراج میں رہنے والا مزدور اپنے لڑکے کو پیٹ رہا تھا۔ لڑکے

کے سیاہ بدن پر لپٹے ہوئے میلے جیکٹ بنیان کا۔ بچا کھچا حصہ اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور لڑکا اب اوپر سے تقریباً ننگا تھا۔ اس کی پیٹھ پر گرمی دانوں نے بڑے بڑے چکتوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نہ نہانے اور ہر وقت مٹی اور پسینے میں لت پت رہنے کی وجہ سے ان پر سیاہ کھرنڈ جم گئے تھے۔ ریکھا کو ابکائی آ گئی۔ نیچے کا باقی سارا منظر بھی ایسا ہی تھا آور تھا۔ کوڑے کے ڈھیر۔ مکھیاں، غلاظت، ان ڈھیروں کے درمیان بیٹھے اسی قدر گندے انسان۔ ایک کوڑے کے ڈھیر سے بالکل ملی ہوئی انگیٹھی جل رہی تھی۔ اس پر دال کی ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔

اس بلڈنگ کے اوپر والے مکینوں کو کوڑا پھینکنے کے لئے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا۔ بس کچن میں لگے ایک لیٹر بکس جیسے ڈھکن کو اٹھا کر کوڑا ڈال دینا ہوتا تھا۔ وہ ایک چوڑے پائپ کے ذریعے نیچے چلا جاتا تھا۔ نیچے ایک کوڑے کا پائپ، پھر دو گیراج، پھر ایک پائپ ـــــ یہ گراؤنڈ فلور کی ترتیب تھی۔ جن لوگوں کے پاس گاڑیاں نہیں تھیں انہوں نے اپنے گیراج نوکروں کو دیے ہوئے تھے۔ کچھ میں چوکیداروں نے مزدوروں کو ناجائز طور پر بسا رکھا تھا۔ کوڑے کو اٹھانے یا کم از کم ڈھکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ افسروں کے نوکر آم کے چھلکے، جھوٹن، مرے ہوئے چوہے اور ننھے بچوں کا کپڑے میں لپٹا ہوا پاخانہ اوپر سے نیچے پھینکتے تھے اور یہ سارا سامان سیدھا گیراج کے باسیوں کی عین ناک تلے آ کر گرتا تھا۔ وہ اس تمام غلاظت اور بو کے درمیان بیٹھے کھانا پکاتے، تاش کھیلتے، شادی بیاہ رچاتے اور بچے پیدا کرتے۔

ریکھا کو پھر ابکائی آ گئی لیکن وہ وہاں سے ہٹی نہیں۔ پورا جسم بے جان ہو رہا تھا۔ کاہلی نشہ بن کر رگوں میں تیر رہی تھی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ ایک رات نیند نہ آ سکے تو جوان جسم بے جان ہونے لگے۔ لیکن یہ آٹھ دن اور باقی بچے کل دو سو روپئے۔ رکی جیلی کے بغیر ٹوسٹ نہیں کھاتا۔ دستر خوان پر گوشت نہ ہو تو انوپ سوالیہ نظروں سے ریکھا کی طرف دیکھتا ہے۔ انندو کی ماں کا خط آیا ہے۔ پچاس روپئے پیشگی مانگے ہیں۔ لکھا ہے آپ بڑے آدمی ہیں پچاس روپیوں سے آپ کا بھنڈار خالی نہیں ہوگا۔ انندو کی بہن

کے یہاں بچہ ہونے والا ہے۔

بڑے آدمی ! اس بڑے آدمی کی بیوی کا بھرم تو رکھنا ہی ہوگا۔ ریکھا نے تلخی سے سوچا۔ پرسوں ایک دوکان میں اسے ایک ساڑی پسند آگئی تھی۔ دام پوچھے۔ ساڑھے چار سو کی تھی۔ ریکھا خاموشی سے اٹھ گئی۔ ٹوتھ پیسٹ پر دام بڑھ گئے۔ اس کے مخصوص شیمپو کی بوتل اس کی پہونچ سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ لگتا ہے اب کوئلے سے دانت گھسنے ہوں گے اور سر میں بیسن ڈالنا ہوگا۔ لیکن بیسن بھی کون سا سستا ہے۔ رما فورتھ اسٹینڈرڈ میں آگئی اور رمی سیکنڈ میں۔ اِن دونوں کو کوچنگ کی ضرورت ہے۔ انوپ ان کے لئے ٹیوٹر کا انتظام کر رہا ہے۔ ہے بھگوان! اس بڑے آدمی کی بیوی کا بھرم کیسے رکھوں۔

انوپ کی تیسری آواز پر اس نے انتہائی سستی سے پیروں کو جنبش دی۔ انڈے ناشتہ ٹیبل پر لگا چکا تھا۔ تین چار بالٹیاں نیچے سے بھر لایا تھا تو ناشتے اور انوپ کے غسل کا انتظام ہو سکا تھا۔ پسینے سے چپچپاتے بدن کے ساتھ ناشتہ کرنے کی خواہش تو نہیں تھی لیکن بادل نخواستہ وہ بیٹھ گئی۔ انوپ نے تلتے ہوئے انڈوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی اور خود ٹوسٹ پر مکھن لگانے لگا۔ اچانک زوں کی آواز کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل کے قریب رکھا پیڈسٹل فین حرکت میں آیا۔ ریکھا بچوں کی طرح تالی بجا کر ہنسی۔ بتی آگئی۔ بتی آگئی۔ پاس کھڑا انڈ و ناچ اٹھا۔ بتی آگئی۔ بتی آگئی۔ اب پانی اوپر آ جائے گا۔ ہا ہا ——

مالتی :

آفیسرز ہوسٹل کی ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے نیچے بنے ننھے سے اسکوٹر گیراج میں رہنے والی مالتی دھوبن نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ برسات کا موسم ہونے کے باوجود کراری دھوپ چمک رہی تھی۔ آج چوتھا دن تھا کہ چھاجوں پانی برسانے والے بادل اچانک گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ فضا میں سخت امس تھی اور دھوپ میں بلا کی تیزی۔ مالتی نے بے حد خوش ہو کر خدا کا شکر ادا کیا۔ پچھلے چار دنوں میں وہ بس اسی بات پر خوش ہو سکی تھی کہ دھوپ نکل آئی تھی اور بارش رک گئی تھی۔ کپڑوں کا بدبودار ڈھیر جو اس

کے ننھے سے کمرے میں اکٹھا ہو گیا تھا وہ اب ڈھیرے ڈھیرے ڈھل کر سوکھنے لگا تھا۔ اس میں سے بہت سے کپڑے استری کرنے کے بعد گاہکوں تک پہونچ گئے تھے۔ لگاتار بارش ہونے سے اس کی آمدنی پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ نہ پریس کے کپڑے آتے تھے نہ ڈھلائی ہو پاتی تھی۔ ڈھلائی نہ ہو تو گاہک پیشگی پیسے بھی جلدی نہیں دیتے۔ پھر بارش کیچڑ ہو تو انگیٹھی جو کمرے کے باہر سلگتی ہے۔ کمرے کے اندر ہی رکھنی پڑتی ہے۔ ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی چنگاری اڑ کر کپڑوں پر نہ جائے۔ ایک مرتبہ گاہکوں کے کپڑے بچانے کے چکر میں اس کا گود کا آٹھ مہینے کا بچہ جلتی انگیٹھی پر گر پڑا تھا۔ جب تک کھانا پکتا تب تک مالتی کی جان نکلتی رہتی۔ اسی شدید تناؤ کی کیفیت سے بچنے کے لئے وہ برسات کے دنوں میں ایک وقت صرف ستو پر بسر کر لیتی تھی۔ صرف رات کو دال چاول اُبالتی۔ کمرے کی بغل میں پڑا کورا بھیگ کر رات دن بھکتا۔ لان بنانے کے لئے جو زمین چھوٹی ہوئی تھی اس میں پانی جم کر ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ ہو جاتی۔ بدبو اور مچھروں کے مارے ناک میں دم تھا۔ چاروں بچے سانپ کی طرح کنڈلی مار کر کپڑوں کے ڈھیر پر سوتے تھے۔ صبح اٹھتے تو ان کے ادھ ننگے جسم پر مچھروں کے کاٹنے کے نشانوں سے سرخ ہو رہے ہوتے۔ بغیر لفٹ کی پانچ منزلہ عمارت کے مختلف فلیٹوں میں کپڑے پہونچاتے پہونچاتے ٹانگیں دکھ جاتیں۔ کل وہ سندھی میم صاحب کے یہاں گئی تھی تو اس وقت میم صاحب پرس کھول کر نوٹ گن رہی تھیں۔ حیرت سے مالتی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مہینے کا آخر اور اتنے نوٹ۔ آخر ان صاحب لوگوں کو کتنے پیسے ملتے ہیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیکر سوچا تھا۔ اگر مہینے کے آخر میں اس کے پاس اتنے روپے ہوتے تو زندگی کتنی حسین ہوتی۔ ایک یہ میم صاحب لوگ ہیں۔ اس نے دس روپے پیشگی مانگے تو یوں بادل نخواستہ دیے جیسے خیرات دے رہی ہوں۔ پھر مہنگائی اور ہاتھ تنگ ہونے کا رونا رونے لگیں۔ جو عورت بیک وقت پانچ چھ قیمتی ساڑیاں پریس ہونے کے لئے بھیجتی ہے اس کا ہاتھ تنگ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے پاس تو بیس بائیس روپے والی دھوتیاں بھی اتنی تعداد میں نہیں ہیں۔ پھر یہ صوفہ، یہ جوڑا سا پلنگ، یہ پھولوں والی چادر ـــــ مجھے تو کچھ نہیں چاہیئے بھگوان۔ بس اتنا بڑا

کمرہ مل جائے جتنا میم صاحب کے پاس ہے خواہ باورچی خانہ الگ نہ ہو۔ کمرہ بڑا ہوگا تو کھانا ایک کونے میں اپنے آپ پک جائے گا۔ گاہکوں کے کپڑے جلنے کا ڈر نہیں رہے گا۔ ہاں ایک لیٹرین ضرور ہو چاہے چار کمروں کے باسیوں پر ایک ہی ہو۔ ابھی تو نالے پر جانا پڑتا ہے۔ کسی دن سویرے نہ جا سکوں تو سارا دن پیٹ کی مروڑ برداشت کرنی ہوتی ہے۔ سورج نکل آنے پر مردوں کے سامنے کیسے جایا جا سکتا ہے اور مرد بھی کون وہ حرامی چار نمبر گیراج کا سائیکل والا۔ جو کپڑے پہنی عورت کو بھی یوں گھورتا ہے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جائے گا۔ بس ایک بڑا کمرہ۔ کوڑے کے ڈھیر سے الگ، مشترکہ لیٹرین، دو چار نئی دھوتیاں، مہینے کے آخر میں کم از کم پچیس تیس روپے — اہا ہاہا۔

اچانک مالتی کے خوابوں پر پانی پڑ گیا۔ اس کے منجھلے لڑکے نے بالٹی لاکر یوں دھم سے رکھی کہ پانی چھلک کر مالتی کے اوپر آ پڑا۔ ابھاگے! دیکھ کر نہیں چلتا۔ وہ چلّانے ہی والی تھی کہ برتن مانجھنے والی یشودا کی ہنسی سُن کر رک گئی۔ وہ ہنس ہنس کر سائیکل والے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بڑی بدمعاش ہے لانبی چوڑی، کلوٹی مگر مرد آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ سائیکل والے کی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کہہ رہا ہے ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ میرا بس چلے تو لائٹ آنے ہی نہ دوں۔ یہ سارے کے سارے اوپر والے لاٹ صاحب ان کی تو . . . . .

سائیکل والا افسروں کی اس پریشانی سے یشودا کو ملنے والی خوشی میں برابر کا ساجھے دار تھا۔ مالتی کی سمجھ میں بات آئی تو اس پر کچھ اوس سی پڑ گئی۔ تو عشق نہیں لڑایا جا رہا ہے بلکہ دونوں لائٹ نہ آنے سے خوش ہیں۔ بھلا ان لوگوں کے دکھ ہی کتنی دیر کے۔ ہر گھر سے فون پر فون ہو رہے ہوں گے۔ تم لوگ کے گھڑی خوش ہو گے ان کو دکھی دیکھ کر۔ پھر پنکھا نہ ہونا، بتّی نہ ہونا بھی کوئی دکھ ہے؟ ہماری تو ساری زندگی بغیر پنکھے پانی کے بیت گئی۔ ہمارے پُرکھوں کی بھی بیت گئی اور ہمارے بچوں کی بھی بیت جائے گی۔

دُکھ تو یہ جو ہے کہ بِل جیسا کمرہ ہے، اس کے آس پاس کی یہ دلدل، یہ مچھر— یہ دن رات سات سات کلو وزن کی استری اٹھا کر کپڑے پریس کرنا، ساری دنیا کی گندگی صاف

کرنا۔ یہ دکھ پرڈیس ان "اوپر والوں" پر تو ذرا خوشی بھی ہو ــــ دھت تیری ایشو دا کی۔ ذرا سی بات میں خوش ہو گئی۔

اچانک پانی چڑھانے والا پمپ ایک جھٹکے کے ساتھ زوں زوں کر اٹھا ــــ بچے چلائے "لین آ گئی"، "لین آ گئی"۔ مالتی کا دس سالہ بیٹا جو کسی گاہک کی کئی عدد قیمتی ساڑیاں ہینگر پر لٹکائے اوپر پہونچانے جا رہا تھا، ساڑیاں بھول کر ناچنے لگا۔ "لین آ گئی"، "لین آ گئی"۔ مالتی کی رگوں میں دوڑتا ہوا لہو اچانک جیسے جم گیا ــــ ابھی جو اگر بے کلف لگا کر پریس کی ہوئی جگ مگ کرتی، کھڑکھڑاتی ساڑیاں اس کیچڑ میں گر جاتیں تو؟ وہ ایک زنّاٹے سے آگے بڑھی، لڑکے کو ایک چانٹا رسید کیا اور سانپ کی طرح پھپھکار کر بولی ــــ ابھاگے روشنی آ گئی تو تو کیوں ناچ رہا ہے؟ تیرے گھر آ گئی کیا؟

مٹھی بھر گھاس

اونگھتے، اُداس، اجاڑ اسٹیشن کو چھک چھک کرتی دیو قامت گاڑی اور اس کا شور بھی جگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ میلا سا چھوٹا سا اسٹیشن، ایک ٹوٹی پھوٹی بنچ، بنچ پر چند مسافر۔ ایک دھندلی آنکھوں والا بوڑھا، ایک نئی بیاہی چھوٹی سی لڑکی جس کی چوڑیوں بھری کلائیاں سرخ ساڑی کے آنچل سے جھانک رہی تھیں۔ ایک جھکے کاندھوں والا ادھیڑ عمر شخص جو لڑکی کے ساتھ تھا، پتہ نہیں باپ تھا کہ شوہر۔ ایک قلی۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

نفیسہ نے سوئے ہوئے ایاز کو جلدی سے اٹھایا۔ اٹیچی اور بید کی بنی ہوئی مسک سی باسکٹ خود ہی نکال لی۔ اونگھتے ہوئے ایاز نے ہولڈرال باہر کیا۔ قلی نئی بیاہی لڑکی کا سامان اٹھا رہا تھا۔ بانس کی رنگین ٹوکری جس میں کچھ سوغات ہوگی۔ ٹین کا بکس، جس پر ہرے لال پھول بنے تھے۔ رسّی سے بندھا ہوا بستر۔ پانی کی صراحی۔ لڑکی نے پیلی پیلی مہندی لگی انگلیوں سے گھونگھٹ ذرا سا سرکایا اور لمحے بھر کو شفاف آنکھوں سے نفیسہ کی طرف دیکھا۔ نظریں چار ہوئیں اور لمحہ سرک گیا۔ اب اس لڑکی سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ پتہ نہیں کون ہے، کہاں جا رہی ہے۔ خوش ہے یا اُداس۔ کون جانے۔ اسٹیشنوں پر نہ جانے کیسے کیسے چہرے دکھائی دیتے ہیں اور دھند میں غروب ہو جاتے ہیں وہ جب گھر سے چل رہی تھی تو ایک خستہ حال بوڑھا میلے انگوچھے سے آنسو پونچھتا سیڑھیاں اتر رہا تھا اور نفیسہ کا دل بھر آیا تھا۔ جھریوں بھرے چہرے پر آنسوؤں نے جال سا بن دیا تھا۔ پتہ نہیں کس سے بچھڑ رہا تھا۔ اب ہر آدمی کے

پاس اپنے ہی دکھ اتنے ہیں کہ پرائے دکھوں میں رونے کی طاقت ہے نہ وقت۔ بڑی املا نے اسے لکھا تھا۔ ٹیڑھی میڑھی تحریر بھی جیسے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ "چند روز کی مہمان ہوں۔ تمہارا میرا ناطہ ہی کیا سگر مل جائیں تو۔" نفیسہ کو گھر سے نکلنے اور سفر کا پلان بنتے بنتے بھی بارہ چودہ دن لگ گئے تھے۔ ایاز کے امتحان ہونے والے تھے۔ وہ ساتھ چلنے سے آنا کانی کر رہا تھا۔ خود نفیسہ انجکشن لے رہی تھی۔ "کورس پورا کر کے جاتیں تو اچھا تھا" اس کے شوہر نے کہا تھا۔

"کیوں ممی ویٹنگ روم میں ٹھہریں گی یا ابھی چلیں اندھیرے میں ہی؟" ایاز کہہ رہا تھا اسٹیشن چھوڑتی ٹرین کی تیز سیٹی میں اس کی آواز دب گئی اور سیٹی کی آواز کے ساتھ نفیسہ کے کے دل میں ہوک اٹھی۔

ایک زمانہ گذرا اسی اسٹیشن سے اسی طرح بڑی اماں بھی رخصت ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ ایسی ہی تھیں۔ اس لڑکی کی طرح۔ ان کے ساتھ بھی ایسی ٹوکریاں تھیں، بہت سا جہیز تھا۔ انہیں رخصت کرنے بہت سے لوگ آئے تھے۔ باپ کی آنکھیں نم رہی ہوں گی۔ بھائی اس شکستہ اسٹیشن کے شکستہ کھمبے سے چپٹا کھڑا رو رہا ہوگا۔ ان کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے ہوں گے۔

دلہن بنی کم سن بڑی اماں کو رخصت کرنے بہت سے لوگ آئے تھے۔ ان کے ساتھ سوغات کی بہت سی ٹوکریاں تھیں۔ ان کے دیہاتی وضع کے مگر قیمتی کپڑوں میں سجا بچکا گوٹا تھا مگر ان کو رخصت کرانے سنجیدہ صورتوں والے صرف پانچ آدمی تھے جن کے کپڑے بہت معمولی تھے۔ ان کا لایا ہوا ساز و سامان بھی بہت معمولی تھا۔ اس لئے کہ دولہا ایک غریب گھرانے کا معمولی حیثیت والا لڑکا تھا۔ غریب، کم سخن، پختہ عمر، سنجیدہ مزاج بلکہ ترش رو۔ نفیسہ کو بڑے ابا کی شادی خوب یاد تھی۔ اس وقت وہ تھی بھی خاصی دس گیارہ برس کی۔

نفیسہ کی ماں کے انتقال سے پہلے وہ شادی کے لئے راضی نہیں ہوتے تھے۔ "آمدنی کم ہے اور خرچ زیادہ" وہ اکثر دادی سے کہا کرتے تھے۔ "کیوں مزید مصیبت میں

ڈالنا چاہتی ہیں اماں"

"خدا رازق ہے بیٹا" وہ کہتیں تو بڑے ابا تلملا کر جواب دیتے "خدا نے رزق بنایا ضرور مگر بانٹنا بھول گیا۔ جس کا داؤں چلے وہ لے بھاگے باقی لوگ حسب توفیق مونہہ تاکتے رہیں"۔ وہ بہت ہی مونہہ پھٹ اور بے ادب تھے اور ضدی بھی مگر نفیسہ کی ماں کا انتقال ہوا تو جھٹ شادی کے لئے راضی ہو گئے ــــ اماں بوڑھی ہو رہی ہیں۔ ان سے کام نہیں ہوتا۔ رہے میاں اشفاق تو انہیں بیوی سے اتنی محبت تھی کہ دوسری شادی کریں گے نہیں سنبھے بکھرے بکھرے پھوہیں گے۔ بچوں یعنی بھتیجے بھتیجوں کو سمیٹنے کے لئے وہ نرم نازک کچی کلی سی بڑی اماں کو بیاہ لائے۔ وہ بے چاری ابھی خود ہی اس لائق تھیں کہ انہیں کوئی سمیٹتا۔

دوسرے پھیرے کے بعد ہی انھوں نے گھونگھٹ الٹ دیا۔ ابھی ان کے ہاتھوں کی مہندی پھیکی نہیں پڑی تھی۔ پتلی پتلی، مہندی لگی پوروں سے ہی انھوں نے سارا گھر سنبھال لیا۔ نفیسہ منی، آؤ تمہاری چوٹی باندھ دوں۔ یہ کرتا پہن کر دکھاؤ تو ذرا، ٹھیک سلا ہے نا؟ سہیل چلو منہہ دھلا دوں۔ ناشتہ تیار ہے عقیل میاں، اسکول کا وقت ہو گیا بستہ ٹھیک سے کر دوں۔ ناشتے کا ڈبہ میں نے تپائی پر رکھ دیا ہے، پلنگ کے پاس۔ آس پاس کی عورتیں ان کی بے حد تعریف کرتی تھیں مگر بڑے ابا کا کرخت چہرہ ہمیشہ سپاٹ رہتا تھا۔ ان کے اور بڑی اماں کے درمیان گفتگو عموماً ان جملوں تک محدود رہتی تھی "اماں کو ڈاکٹر کے ہاں لے گئی تھیں؟ کیا کہا اس نے؟ یہ نفیسہ آج کل بہت اچھلتی پھرتی ہے ذرا پڑھنے کی تاکید کیا کرو اس کو۔ عقیل آج کل بڑا دبلا دکھائی دے رہا ہے اس کے کھانے پر توجہ کرو"ــــ بڑی اماں کے جواب عموماً بے حد مختصر ہوا کرتے تھے "جی ہاں ــــ جی نہیں ــــ بہت اچھا ــــ ضرور"

سارے گھر کا کام نمٹا کر، دادی کے پیر دبا کر جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جاتیں تو عموماً بڑے ابا اس وقت کوئی کتاب یا اخبار سینے سے لگائے خراٹے بھر رہے ہوتے تھے۔

شادی کے بعد جب نفیسہ اپنے شوہر کے شانے پر سر ٹکا کر گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں کرتی اور وہ اس کے لانبے بالوں سے کھیلتا رہتا تو نفیسہ کی سمجھ میں آیا تھا کہ بڑی اماں زندگی میں

گہری رفاقت اور محبت کے کتنے بڑے سکھ سے محروم تھیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ انہیں اس محرومی کا احساس تھا ورنہ ایسا نہ ہوتا کہ وہ ہنستیں اور ان کی آنکھیں خاموش رہتیں۔ کیسی عجیب سی مسکراہٹ تھی ان کی، جو صرف ہونٹوں تک محدود رہتی تھی۔ وہ شاذ و نادر ہی ہنستیں یا مسکراتیں لیکن جب بھی ایسا ہوتا ان کی آنکھیں ان کے چہرے سے الگ ہو جاتیں۔ کچھ باتیں اس وقت سمجھ میں آتی ہیں جب ان کو سمجھنے کا وقت گذر چکا ہوتا ہے۔ نفیسہ نے بھی جب ان کو سمجھا، ان کے درد کو محسوس کیا وہ خود اپنی گرہستی میں ضم ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ کنبے کے دوسرے افراد کی یادیں بھی مدھم ہوتی چلی گئی تھیں۔ بڑے ابا جنہوں نے اس کے اور اس کے بھائیوں کے لئے شادی کی تھی۔ ان کی بے پناہ محبت، ابا، دادی، سب پر شوہر اور بچے محیط ہو گئے تھے کہ ہندوستانی عورت کی زندگی انہیں سے عبارت ہے۔

نفیسہ رخصت ہو رہی تھی تو انھوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے کہا تھا۔ "بیٹی، میں بے اولاد رہی اس لئے نہیں جانتی کہ اولاد کی محبت کیسی ہوتی ہے مگر اللہ جانتا ہے میں نے اپنا فرض نبھایا۔ تمہارے بڑے ابا، تمہارے ابا اور تمہاری مرحومہ ماں کے سامنے سرخرو ہوں۔ پھر بھی کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو معاف کر دینا"۔ ان کے چہرے پر کرب تھا۔ وہ نفیسہ سے صرف سات آٹھ برس بڑی تھیں لیکن بوڑھی لگ رہی تھیں۔ اذیت کی شدت نے نفیسہ کو گنگ کر دیا تھا۔ وہ اس وقت رو بھی نہیں سکی۔

—— دھند کو چیرتا ہوا کشتہ آگے بڑھ رہا تھا۔ رات کے پتلے پردے کے پیچھے سے شہر کی مدھم مدھم روشنیاں چمک رہی تھیں۔ نفیسہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بڑا سا چمکیلا تارا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ تارا روز صبح اس کے الہ آباد والے مکان کی چھت سے بھی دکھائی دیتا تھا۔ دو دیواروں سے بننے والے کونے کے پیچھے سے۔

بڑی اماں شاید اسی تارے کا ذکر کرتی تھیں۔ بڑے سے گھر کے کچے آنگن میں لگی ہوئی سدا بہار کی گھنی بیل کا اور ایک بڑے سے روشن تارے کا جوان کے لگائے ہوئے بیر کے درخت کے پیچھے سے چمکا کرتا تھا۔ ایک بار انھوں نے ہنس کر کہا تھا۔ "نفیسہ میری کیا دیوں

کی گھاس بہت ڈھیٹ تھی۔ میں مٹھی بھر بھر کر اکھاڑتی مگر دوسرے دوسرے دن وہ وہیں کی وہیں نظر آتی۔ یہاں تو گھاس تک نہیں ہے۔" ان کی سیاہ آنکھیں اور سیاہ ہو گئی تھیں جیسے ان میں بادل گھر آئے ہوں۔

پھولوں اور سبزے سے انہیں عشق تھا اور جب وہ اپنے سارے شوق جلا کر خاک کرنے لگی تھیں تو یہ واحد شوق تھا جسے بچا کر انھوں نے پلو سے باندھ لیا تھا۔ سہیل سے انھوں نے دو گملے منگائے اور بیلے اور گلاب کا ایک ایک پودا۔ شاید یہ واحد خرچ تھا جو اپنی مرضی سے انھوں نے اپنی ذات پر کیا تھا۔ بڑے ابا سے وہ بہت ڈرتی تھیں لیکن جب پودے بڑے ہوئے پر ایک دن وہ غرا کر بولے تھے کہ کیا جھاڑ جھنکار اکٹھا کر رکھا ہے تو انھوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اڑا گئی تھیں۔

سہیل کی شادی ہوئی اور دُلہن آئی تو باتھ روم کے پاس سے وہاں کی جگہ گھیر کر ایک عارضی کمرہ بنایا گیا تھا اس لئے کہ دلہن کا جہیز رکھنے کے لئے کہیں جگہ نہیں تھی۔ گملے اٹھا کر پڑوس کے منشی جی کو دیدیے گئے۔

رکشہ ایک تنگ گلی میں مڑ چکا تھا اور اندھیرے سے تھوڑی تھوڑی کرنیں جھانکنے لگی تھیں۔ دور سے ایک بالکل شکستہ مکان دکھائی دے رہا تھا۔ کھنڈر جیسا۔ یہی ہے فضل منزل۔ رکشے والا کہہ رہا تھا۔ گھر کے بوڑھے تو چلنے کیسے کے مرکھپ گئے، جوان ادھر ادھر ہو گئے۔ ایک بوڑھی عورت رہتی ہیں۔ شاید فضل صاحب کی بٹیا ہیں۔ سسرال میں بھی سب مرکھپ گئے تھے۔ بال بچے کس کو پوچھتے ہیں۔ یہیں آگئیں رہنے کو۔

چھوٹے سے قصبے میں سب ایک دوسرے کو کتنے قریب سے جانتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ جان پہچان کھل جاتی ہے۔ نفیسہ کو رکشے والے کی دخل اندازی ناگوار گزری۔

خستہ حال مکان اور پاس آگیا تھا۔ ایک دروازہ جو سلامت تھا اس میں بڑا سا تالا لٹک رہا تھا۔ تالا کیوں لٹک رہا ہے، وہ کہاں جا سکتی ہیں؟ اس نے سوچا۔ "ٹھہرئیے ذرا

میں پوچھتا ہوں۔" ایاز تو اونگھ رہا تھا۔ رکشے والے نے ہی مستعدی دکھائی۔ بغل کے مکان سے ایک بزرگ نکل رہے تھے شاید صبح کی نماز کے لئے مسجد جا رہے تھے۔ رکشے والے نے انہیں روکا۔

وہ ۔ وہ میر فضل مرحوم کی صاحبزادی۔

ان کا تو پرسوں انتقال ہو گیا۔ کون آیا ہے ان سے ملنے۔ وہ ذرا تاسف بھرے لہجے میں بولے اور رکشے کے قریب آ گئے۔

—— انتقال ہو گیا۔ جملہ بھری بندوق کی طرح چھوٹا اور نفیسہ کے دماغ میں پیوست ہو گیا۔ اس کا ذہن ایسا سُن ہوا کہ موت کی سنگینی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ انتقال ہو گیا؟ کیوں ہو گیا؟ مجھ سے ملے بغیر کیسے ہو گیا؟ بھرے گھر میں وہ مجھ سے ہی تھوڑا مانوس تھیں۔ مجھ سے ملے بغیر کیسے مر گئیں؟

آئیے ہمارے یہاں بیٹھ جائیے۔ آپ لوگ شاید دور سے آرہے ہیں۔ آئیے آئیے۔

وہ مہربان بزرگ انہیں اپنے یہاں لے گئے۔ ان کی نیک بوڑھی بیوی جلدی سے چائے بنانے لگیں۔ پھر جیسے بڑا سا گدھ پر پھیلا کر دھیرے دھیرے فضا میں چکراتا ہوا نیچے اترتا ہے اسی طرح موت کی قطعیت نفیسہ پر واضح ہونے لگی۔ وہ مر چکی ہیں۔ کیوں، کہاں، کیسے کی تہ سے دور۔ قیام پاکستان کے بعد جب ان کے والدین اور بھائی صرف یہ مکان ان کے نام چھوڑ کر سرحد پار چلے گئے تھے اور وہ بھری دنیا میں بالکل ہی تنہا تھیں تو نفیسہ ہی وہ واحد ہستی تھی جس سے وہ تھوڑا قریب تھیں اور کچھ کہہ سن لیتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ لڑکی تھی اور اسکی فطری ہمدردی اور محبت نے اُسے ان سے قریب کر دیا تھا۔ نفیسہ کی شادی، سہیل اور عقیل کی تعلیم، دادی کی موت، دیور کا نروس بریک ڈاؤن، شوہر کا فالج اور پھر موت، سب نمٹا کر وہ اپنے گھر آ گئی تھیں جہاں انھوں نے جنم لیا تھا۔ تنہائی ڈستی تو کبھی کبھی نفیسہ کو ہی خط بھی لکھ لیتی تھیں۔ نفیسہ آ جاتی تو آخری لمحوں میں مل کر شاید انہیں احساس ہوتا کہ ان کے پاس کوئی اپنا ہے ایسی ہستی ہے جس کے اور ان کے درمیان اپنائیت کی ایک پتلی سی ڈور بندھی ہے۔ شاید کچھ کہتیں، کچھ سنتیں۔ آنسو جھر جھر نفیسہ کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ وہ بوڑھی خاتون تسلی دینے لگیں۔

ایاز خاموشی سے منہ تکتا رہا کہ نئی نسل کے پاس بوڑھوں کے لئے آنسو بہانے کا وقت نہیں ہے ۔

ان کی چابی ہمیں لوگوں کے پاس ہے ۔کفن دفن ہم ہی نے کیا تھا ۔ آپ چابی لے لیجئے ۔ ان کی وصیت کے مطابق انہیں گھر کے آنگن میں دفن کیا گیا تھا ۔ فاتحہ پڑھ لیجئے گا ، پہلے منہ ہاتھ دھو لیجئے گا ۔ مگر نفیسہ اسی وقت اٹھ کھڑی ہوئی ۔

کھنڈر کا دروازہ چرچرایا ۔ اینٹوں اور ملبے سے الگ ہٹ کر ایک صاف کی ہوئی کیاری کے پاس ان کی قبر تھی ۔ اس کی تازہ کھدی مٹی کی تازگی اور بھر بھرا پن دور سے دکھائی دے رہا تھا ۔ آس پاس بہت سی گھاس تھی ۔ تین دن کے اندر ذرا ذرا سی گھاس نے بھربھری مٹی کے اندر سے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا ۔ نفیسہ کو ان کی ہنسی سنائی دی ۔۔۔ میرے آنگن کی گھاس بہت ڈھیٹ تھی نفیسہ جیا ۔۔۔ میں مٹھی بھر بھر اکھاڑتی تھی ، دوسرے دن پھر حاضر ۔ دو چار روز میں یہ گھاس پوری قبر کو ڈھک لے گی ۔ شاید ان کا واحد حاصلِ زندگی یہی ہو گا ۔

کیوں مر گئیں بڑی اماں ۔۔۔ مجھ سے پوچھے بغیر ۔ مجھ سے ملے بغیر ۔ مجھ سے ملے بغیر کیوں مر گئیں ۔ قبر سے لپٹ کر ادھیڑ عمر نفیسہ بچوں کی طرح چلّا کر رو پڑی ۔

○

شکستہ پروں کی اُڑان

"کس نفنگ کے چکر میں پڑی ہو۔ خدا خدا کرو۔ لڑکی جوان ہو رہی ہے۔" دلہن چچی نے پھر وہی بات کہی جس سے ناصرہ بیگم کو پتنگے لگتے تھے۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ بھلا یہاں لڑکی کے جوان ہونے کا کیا ذکر ہے اور خدا خدا کرنے کو تو ابھی عمر باقی ہے۔ میاں بھری جوانی میں داغ دے گئے۔ تو اس کا مطلب یہ کیسے ہو گیا کہ بے چاری بیوہ مسجد میں تبدیل ہو جائے۔ ناصرہ بیگم کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔

"ہم کیوں جلتی ہو جی۔ ساری عمر مصلے پر بیٹھی رہیں۔ کیا نتیجہ ملا؟ سُنا ہے تمہارے میاں آج کل پھر اُسی کل چڑی کے ساتھ دیکھے جا رہے ہیں۔" انھوں نے دلہن چچی کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

دلہن چچی رومال پر پھول کاڑھتے کاڑھتے اچانک رُک گئیں۔ "دشمنوں نے اڑائی ہو گی۔ آفس میں ساتھ کام کرتی ہے۔ ان کی ماتحت ہے۔ کہیں راستہ چلتے مل گئی اور دو باتیں کر لیں تو لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔"

"اجی ہاں۔" ناصرہ بیگم دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسیں۔ "تمہارے میاں ایسی ہی مشہور ہستی ہیں کہ لوگ ان کی ذاتی زندگی کی ٹوہ میں لگے رہیں۔ اور کوئی کام نہیں لوگوں کو؟ کھلے عام مونہہ مارتے دیکھتے ہیں جب ہی کہتے ہیں کچھ۔"

"بلا سے۔" دُلہن چچی کی انگلیاں چابکدستی سے نقش و نگار بناتی رہیں۔

"مرد لٹیرے۔ مگر بندھے تو اسی کھونٹے سے ہیں۔" انھوں نے دوپٹے کے پلو کی طرف اشارہ کیا۔ "شام ڈھلے آجاتے ہیں۔ دن کا حساب لینے میں نہیں جاتی۔ مگر بیوی تم تو عورت ہو پھر عمر خاصی ہو گئی۔ اب تو بیٹی بیاہنے کی فکر کرو۔"

ناصرہ بیگم کو ایسا لگا کہ جیسے ان کا پاؤں جلتے توے پر پڑ گیا ہے۔ وہ خود دلہن بننے کی فکر میں تھیں اور یہ کالی زبان والی دلہن چچی انہیں ساس بنانے پر مُصر تھیں۔ ابھی سیاہ بالوں میں ڈھونڈنے سے بھی چاندی کا تار نہ ملتا۔ ستار کے تاروں جیسا کسا کسایا بدن اور چکنی شفاف جلد۔ عورت کی عمر بس اتنی ہی ہوتی ہے جتنی دیکھنے والے کو لگے۔ نہ ایک دن کم نہ ایک دن زیادہ۔ ان کا جی چاہا دلہن چچی کے ہاتھ سے سوئی لے کر ان کا مونہہ سی دیں۔ زبان سے آگ جھڑتی ہے۔ کیا مزے سے بارود میں فلیتہ لگا کر اطمینان سے کام کرتی رہتی ہیں۔ مگر ناصرہ بھی ہر پھر کر اپنی داستان سنانے دلہن چچی کے پاس ہی آتی ہیں۔ وہ ان کی واحد سہیلی تھیں۔ رشتے کے چچا کو بیاہ گئیں اس لئے دلہن چچی کہلائیں۔ زبان کترنی کی طرح چلتی تھی مگر دل کی صاف اور کھری اور دوستی نباہنے والی تھیں۔

جس دن اسد سے ملاقات ہوئی، ناصرہ بیگم کے چہرے پر گلاب کھل جاتے۔ دل میں پنکھے لگ جاتے، جی چاہتا گھر کی چھت پر چڑھ جائیں اور ساری دنیا سے پکار پکار کر کہیں "آج اس نے پھر پیار سے دیکھا"، مگر ان کی ساری دنیا دلہن چچی کی ذات میں سمٹ جاتی تھی جو تھیں تو عورت مگر پیٹ کی ہلکی نہیں تھیں۔ ان کی زبان تیزاب کی بوچھار کرتی تھی۔ پھر بھی ناصرہ بیگم ان کے سامنے جی کا بوجھ ہلکا کئے بغیر نہ رہتیں۔

اسد پڑوس میں رہنے والی مسز خان کے بھائی تھے۔ ابھی تک تو جانے دنیا کے کس نہاں خانے میں پوشیدہ تھے لیکن پچھلے چھ ماہ سے انھوں نے بہن کے یہاں مستقل پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ مسز خان لاولد تھیں۔ بڑے سے بنگلے میں بس دو میاں بیوی۔ اس لئے اکثر رشتہ دار آتے جاتے رہتے تھے خوب خاطریں ہوتیں۔ اسد نے تعلیم ختم کر کے پہلے سرکاری نوکری کی پھر نہ جانے کیا سوجھی کہ نوکری چھوڑ کر پرائیویٹ پریکٹس کی دھن میں مسز خان کے

یہاں آ بسے۔

ناصرہ بیگم جانِ محفل تھیں۔ بیوگی نے ان کے مزاج پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ میاں شروع سے ہی بیمار رہتے تھے۔ منحنی، دھان پان، اب مرے کہ جب مرے، اس پر چڑچڑے، بدمزاج۔ بیوی جس قدر خوش مزاجی دکھاتیں، انہیں اسی قدر پتنگے لگتے۔ ناصرہ بیگم کی ہی ہی ٹھی ٹھی پر البتہ کوئی اثر نہ پڑتا۔ مزے سے بھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہنتیں، گوری گوری ہتھیلیوں میں مہندی رچاتیں۔ لانبے جھمکے ان کے بیضوی چہرے پر بہت کھلتے مگر میاں کے منہ کا مزہ دواؤں نے کچھ ایسا کڑوا کر دیا تھا کہ انہیں کچھ بھی میٹھا نہ لگتا۔ ہر وقت تیوریاں چڑھی رہتیں۔ نہ جانے کیسے پندرہ برس گھسیٹ گئے۔ ان کی موت کے بعد ناصرہ بیگم چند دن تو دوپٹے سے ناک رگڑتی رہیں، یاسمین کو چمٹا کر ایک آدھ مرتبہ چیخیں چلائیں بھی مگر پھر وہی باغ و بہار ہنسی انہیں ہر وقت شرابور رکھتی اور دوسروں کو بھی بھگو بھگو جاتی۔ کہیں شادی ہو تو ڈھولک بجانے اور گیت گانے کو تیار، دعوت ہو تو بریانی اور شیر برنج پکانے کو تیار۔ ہر تقریب، ہر رسم میں شریک۔ بیوہ ہونے پر بھی کوئی ان سے وہم نہیں کرتا تھا۔ کچھ ایسی دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت تھی انکی۔

جائداد کافی تھی اور اولاد صرف سترہ برس کی کچی کلی سی یاسمین جو بیٹی کم اور بہن زیادہ نظر آتی۔ میاں اپنی زندگی میں بھی مدِ فاضل تھے۔ تھے تو بھی ٹھیک تھا، چلے گئے تو بھی ٹھیک۔ زندگی سکون کے ساتھ رواں دواں تھی کہ کہیں سے اسد نازل ہو گئے۔ ایک بڑا سا پتھر پھینکا چھپاک! اور ناصرہ بیگم کی ناؤ ہچکولے کھانے لگی کبھی ادھر کبھی ادھر۔ مگر گلے گلے ڈوب کر وہ بہت خوش تھیں۔

بھلا میٹھی میٹھی نظروں کی ابتدا کسی کو یاد ہوتی ہے کہ کب کس نے کہاں کیوں کر دیکھا؟ وہ ابتدا تو کہیں سے سرسراتے ریشم کی طرح پھسل آتی ہے اور زمان و مکان کا احاطہ کر جاتی ہے۔ ناصرہ بیگم کو بھی ابتدا کا پتہ نہ تھا۔

ایک بار انھوں نے بیلے کی کلیوں کے بہت سے گچھے ڈھیر کر دیے تھے، کچھ مسز خان کی طرف، کچھ ناصرہ بیگم کی طرف۔ پھر ہنس کر بولے تھے "آپا، آپ کیا کیجئے گا؟ اپنے حصے کے

بھی انہیں کو دے دیجیے۔ لانبی چوٹی پر پھول بہت زیب دیتے ہیں۔"

مسز خان کے بال بہت چھوٹے تراشے ہوئے تھے۔ وہ خوش مزاجی سے ہنسنے لگیں۔ انہیں بھی ناصرہ بیگم کے گھنے اور لانبے بال بہت پسند تھے۔

ایک بار سب لوگ اکٹھے پکنک کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اسد نے سہارا دیکر ناصرہ بیگم کو گاڑی سے اتارا تھا اور اتارتے ہوئے شاید جان بوجھ کر دیر لگائی تھی اور اس بار تو کمال ہی ہو گیا۔ انھوں نے ناصرہ بیگم کی جھولتی ہوئی بالیاں چھو لی تھیں "بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر سب کچھ زیب دیتا ہے، لانبے جھمکے ہوں یا گول بالیاں۔" انھوں نے اپنی ٹھہری ہوئی آواز میں کہا تھا اور ناصرہ بیگم کی آنکھوں میں یہاں سے وہاں تک جگنو سے جھم جھم کرتے چلے گئے تھے۔

"بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر سب کچھ زیب دیتا ہے، بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جن پر سب کچھ زیب دیتا ہے۔ بعض چہرے ——" کسی نے یہ جملہ ریکارڈ کر کے ٹیپ ان کے دل میں فٹ کر دیا اور وہ اسد دلہن چچی کے آنگن میں بجاتے چلی آئیں۔

دلہن چچی کو اس عمر میں ان کی عشق بازی ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ بار بار ان کی آنکھوں میں جوان ہوتی ہوئی یاسمین کا سراپا گھوم جاتا اور وہ مزید چڑ جاتیں۔ ناصرہ بیگم نے یہ بالیاں چھونے والی بات بتائی تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"اری بیوی! تو نوبت ہاتھا پائی تک پہونچ رہی ہے۔" جلبلا کر بولیں اور ناصرہ بیگم کے پورے وجود میں شعلے رینگ گئے۔ اس سے بری گالی انہیں کبھی کسی نے نہیں دی تھی۔ کہاں وہ ننھا سا، نرم سا، رومان پرور لمس جو سونے کی بالیوں سے گزرتا ہوا ان تک پہونچا تھا اور کہاں ہاتھا پائی جیسا مکروہ لفظ۔ انہیں ایسا لگا جیسے بچپن کی دوستی کی بنیادیں ڈھے رہی ہیں۔ پہلی بار انہیں دلہن چچی پر اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا کھیرے کی طرح انہیں چبا کر رکھ دیں کچر کچر۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور شعلہ بار نگاہوں سے انہیں دیکھتی ہوئی بولیں۔ "ذرا زبان سنبھال کر بولا کرو۔ تمہیں رازدار سہیلی سمجھ کر دل کی بات کر لیتی ہوں تو تمہیں گالیاں دینے کا حق کیسے مل گیا؟ آئندہ اس طرح کی بات کی تو خدا کی قسم کبھی صورت نہیں دیکھوں گی۔"

دلہن چچی اسی دل جلانے والے ٹھنڈے پرسکون چہرے کے ساتھ میاں کی بش شرٹ پر استری پھیرتی رہیں۔ پھر چند لمحوں بعد شفاف نگاہیں اٹھا کر بولیں۔ "تو اس لفنگے کی خاطر تم برسوں کے تعلقات ختم کرو گی؟ وہ چڑھتا سورج ہے۔ جوان، کنوارا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تم؟" مناسب تشبیہہ ہاتھ نہ آنے پر وہ لمحہ بھر کو خاموش رہ گئیں۔ "میری بات گرہ میں باندھ لو بتو۔ کوئی مرد اپنے سے بڑی اور جوان بیٹی کی ماں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ تفریح کر رہا ہے۔ خدا سے لو لگاؤ ناصرہ۔ کیوں برباد ہونے پر تلی ہوئی ہو۔"

ناصرہ بیگم سرخ ہو کر پھٹ پڑنے والے مقام پر پہونچ کر دفعتاً سیاہ پڑ گئیں۔ وہ جوان بیٹی کی ماں بہر حال تھیں۔ اس کی جوانی سے وہ کب تک آنکھیں چراتی رہیں گی؟ دو برس؟ چار برس؟ پھر ان کی اپنی جوانی کتنے دن اور ساتھ دے گی؟ دو برس؟ چار برس؟ یہ حسن کب تک برقرار رہے گا؟ یہ جلد کب تک تنی رہے گی؟ انہیں سانپ سونگھ گیا۔ بھڑکتے شعلوں پر جیسے کسی نے بالٹی بھر ٹھنڈا پانی ڈال دیا تھا۔

"وہ جوان کنوارا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور تم؟" دلہن چچی کیا کہتے کہتے رک گئی تھیں ڈھلتی دھوپ؟ مزے سے اترا ہوا پھل؟ مرجھایا ہوا پھول؟ کون سی تشبیہہ ان کے ہونٹوں پر آکر منجمد ہو گئی؟ کانپتی ٹانگوں سے ناصرہ بیگم بیٹھ گئیں۔ خاموشی سے دلہن چچی کے ہاتھ کا بنایا ہوا لذیذ ناشتہ زہر مار کیا۔ انتہائی خوش مزہ چائے گلے سے پار کی اور دل برداشتہ سی گھر چلی آئیں۔

اپنے گھر کے چھوٹے سے لان کو پار کرتے ہوئے وہ پھر اس سے ٹکرائیں۔ آپ؟

وہ ہکلائے ——— میں آپ سے ملنے آیا تھا۔ سجادی بوا نے بتایا کہ آپ اپنی چچی کے یہاں گئی ہوئی ہیں تو میں واپس ہونے لگا۔ وہ کچھ بوکھلائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔

ناصرہ بیگم کھل اٹھیں۔ دلہن چچی کا جگایا ہوا درد لمحے بھر میں برسات کی دھوپ کی طرح اڑ گیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ اس اونچے، چوڑے، مضبوط مرد کے بازوؤں میں خود کو گم کر دیں۔ دل سڑک کوٹنے والے انجن کی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ بڑی مشکل سے

وہ بولیں۔ "کیوں خیریت تو ہے؟ میرا خیال کیسے آیا؟"

"جی خیریت ہی خیریت ہے۔" وہ مسکرائے۔ "آپ کے لئے کچھ میگزین لایا تھا۔ آپ کہہ رہی تھیں نا کہ جی نہیں لگتا۔ ایک ناول بھی ہے۔"

"خاک پڑے دلہن بچی پر۔ کیسا دہلاتی ہیں۔ میری اور اس کی عمر میں مشکل سے تین چار برس کا فرق ہوگا۔ خاندان میں ہی کتنی شادیاں ایسی ہوئی ہیں جن میں دلہن دولہا سے بڑی تھی۔ یورپ میں تو آئے دن یہ ہوتا رہتا ہے۔ 'نیسی کیسی' جیسا محاورہ شاید دنیا کی کسی اور زبان میں رائج نہیں ہے۔"

'اللہ اللہ کرو'— اجی عمر پڑی ہے اللہ اللہ کرنے کو۔ اور بڑھاپے میں بیٹھ کر کرنا ہی کیا ہے۔ بس بہو بیٹیوں پر حکم چلانا اور تسبیح گھمانا۔ محبوب کے سامنے ہونے کے باوجود وہ دل ہی دل میں دلہن بچی پر غصہ اتارنے لگیں۔ پھر اچانک انہیں اسد کی موجودگی کا احساس ہوا جو کسی گھنے سایہ دار درخت کی طرح سامنے کھڑے تھے۔

"آئیے اب چائے پی کر جائیے گا۔" ان کی آواز کی تہہ میں خوشی کی ایک پتلی سی دھار بہہ رہی تھی ترل رل، ترل رل — جیسے اوپر سے سخت دھرتی کے اندر میٹھے پانی کا جھرنا بہتا ہے۔

اسد کسی فرمانبردار پالتو جانور کی طرح پیچھے ہو لئے۔ ناصرہ بیگم نے ڈرائنگ روم کی بتی جلائی۔ کچن میں سجادی بوا کھڑپڑ کر رہی تھیں۔ آنگن میں مولسری کے درخت کے پاس ٹیبل بچھائے یاسمین ہوم ورک میں مصروف تھی اس کا دوپٹہ کرسی کی پشت پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھایا ایک نظر ماں پر ڈالی، دوسری اسد پر اور پھر سر جھکا کر اکبر اور بابر کے رشتوں کی وضاحت میں مشغول ہو گئی۔ کل اس کا ہسٹری کا امتحان تھا۔

ناصرہ بیگم نے سجادی بوا کو بلا کر کہا کہ وہ باڑھ پھلانگ کر مسز خان کو بھی بلا لائیں اور چائے کا پانی اسٹوو پر رکھ دیں۔ پھر وہ مہدی حسن کے کچھ نئے ریکارڈ نکال کر اسد کو دکھانے لگیں۔ جو وہ پرسوں ہی خرید کر لائی تھیں۔

اسد ریکارڈ لینے کو جھکے تو ناصرہ بیگم کا ملائم اور معطر دوپٹہ ان کے سر سے ٹکرایا۔ انھوں نے ایک لمبی سانس لی۔ "آپ کا ذوق بہت پاکیزہ ہے۔ کیا موسیقی اور کیا سجاوٹ اور لباس۔ افسوس کہ کوئی قدردان نہیں ہے۔ ایک ذاتی بات کہوں آپ سے؟"

شاید وہ لمحہ قریب آگیا ہے ـــــ بہت قریب۔ اتنا قریب کہ اب وہ انہیں چھولے گا۔ ناصرہ بیگم نے ڈوبتی ابھرتی سانسوں کے ساتھ سوچا۔ اسد شاید آسمان کی لامتناہی اور بے کراں وسعتوں کے اُس پار سے بول رہے تھے۔

"آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟"

لمحہ ناصرہ بیگم کو چھو چکا تھا۔ وہ پسینے میں نہا گئیں۔ بوکھلاہٹ میں ریکارڈ ان کے ہاتھ سے چھوٹ پڑے۔

میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔ اسد کی آنکھیں انتہائی مہربان اور شفیق تھیں۔ ناصرہ بیگم بیہوش ہونے ہی والی تھیں کہ مسز خان اچانک دھڑدھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"کیا غلط صحیح ہو رہا ہے بھئی؟"

"کچھ نہیں آپا میں کہہ رہا تھا کہ چائے کی بڑی شدید طلب ہو رہی ہے۔"

اس رازداری نے ناصرہ بیگم کو نہال کر دیا۔ ہاں بھلا مسز خان کے سامنے وہ کھلم کھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں بڑی بہن ٹھہریں۔ انھوں نے بوا سے چائے کے لئے کہا اور پھر ریکارڈ پلیئر آن کر دیا۔

اکتوبر کے گلابی جاڑوں کی اس گلابی رات کو ناصرہ بیگم کو نیند نہیں آئی۔

"آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے" ادھر وہ سونے کی کوشش کرتیں اور ادھر کوئی کان میں پکارتا اور وہ جاگ پڑتیں۔ ذرا کوئی دلہن بجی سے جا کر کہے کہ اسد نے کیا کہا ہے۔ بڑی آئیں عمر کا طعنہ دینے والی۔ کل ہی جا کر بتا دوں گی۔ کیا دوستی نبھا رہی ہیں۔ ضرور جلتی ہوں گی۔ میری ہم عمر ہیں مگر توند نکل آئی ہے۔ آنکھوں کے گرد جھریاں

دکھائی دینے لگی ہیں۔ رنگت میں وہ آب نہیں رہی۔ اوپر تلے پانچ بچے پیدا کر کے بہت خوش ہیں۔ پہلی مرتبہ ناصرہ بیگم کو خیال آیا کہ اچھا ہی ہوا جو ان کے میاں مریل چڑی مار تھے کہیں آج ان کے بھی دو چار بچے اور ہوتے تو اسد پاس پھٹکتے بھی نہیں۔ بلا سے میں دو چار برس بڑی ہوں۔۔ دیکھنے میں تو ہرگز نہیں لگتی۔ جوش میں آ کر انھوں نے سرہانے لگا سوئچ دبا دیا، کھٹ سے روشنی ہوئی اور رات کے دو بجے وہ مسہری کے مقابل رکھی ہوئی سنگھار میز کے قد آدم آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگیں۔ انھوں نے ذرا اترا کر دیکھا وہ مشکل سے تیس کی نظر آتی تھیں۔ چھریرا بدن، صاف رنگت، بے عیب جلد، غلافی آنکھیں جو نیندا سی ہو کر اور زیادہ غلافی ہو گئی ہیں۔ اچانک ان کی آنکھوں تلے ایک سایہ لہرایا۔

ان کے کمرے کی کھڑکی مسز خان اور ان کے اپنے مکان کے درمیانی گھاس کے قطعے پر کھلتی تھی یہ وہم نہیں تھا۔ گھاس کے اس قطعے پر انھوں نے قدموں کی سرسراہٹ بالکل صاف سُنی تھی، غالباً یوں اچانک ان کے کمرے کی بتی جلنے پر کوئی روشنی سے بچ کر دبے پاؤں بھاگا تھا۔ انھوں نے ٹارچ اٹھائی اور سجادی بوا کے شوہر کو پکارتی ہوئی باہر نکل آئیں۔ وہ دونوں میاں بیوی باورچی خانے سے ملحق کوٹھری میں سوتے تھے۔

سامنے سے یاسمین آ رہی تھی۔ بلی کی طرح دبے پاؤں۔ بدن سمیٹے۔ اکتوبر کے گلابی جاڑوں کی خنک رات میں پسینے سے نہائی ہوئی۔

ناصرہ بیگم کے پاؤں دھرتی نے پکڑ لیے۔ بٹیا تم؟ وہ کچھ یوں بدحواس ہو گئیں کہ اگر ڈاکوؤں کی پوری فوج بھی گھر میں داخل ہو جاتی تو بھی نہ ہوتیں۔ پھر وہ اچانک چیخیں —
"یاسمین کون تھا؟"

چاروں طرف سے گھر جانے پر حملہ کر دینے والی بلی کی طرح یاسمین تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے جسم کی قوسیں نمایاں ہو گئیں۔ اور اس شدید کرائسس کے لمحے میں بھی ناصرہ بیگم کو سوچنا پڑا کہ ان کی بیٹی واقعی جوان ہو گئی ہے۔ دلہن چچی سچ کہتی ہیں۔

"باہر اسد تھے امی! مگر خدا کے لیے پہلے پوری بات سن لیجیے پھر کچھ بولیے گا۔

ہماری محبت پاک ہے ۔ اسعد مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں ۔ ابھی تک انھوں نے آپ سے کچھ نہیں کہا ہے ، صرف اس لیے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ شاید آپ مجھے گریجویشن سے پہلے شادی کے بندھن میں جکڑنا پسند نہ کریں ۔ اور اسی لئے وہ آپ کی آنی للّو چپو کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے کنبے میں گھل مل جائیں ــــ ...... اور ......"

یاسمین نے اور کیا کیا کہا ، ناصرہ بیگم سن نہیں سکیں ۔ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح دھم سے وہ وہیں برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ گئیں ۔ ماہ وسال کی جو دھول برساتی آندھیاں ان کے قریب سے کنّی کاٹ کر گزر جاتی تھیں ، اب اچانک کوڑے برسانے لگیں ۔ پڑوس کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو ناصرہ بیگم اٹھیں اور انھوں نے کپڑوں کی الماری میں وہ جا نماز تلاش کرنا شروع کر دی جسے عرصہ پہلے وہ کہیں رکھ کر بھول چکی تھیں ۔

○

کالے میگھا پانی دے

بوڑھی کیتکی کو بخار آتے ہوئے آج ساتواں دن تھا۔ کوئی تین دن ہوئے پڑوس میں رہنے والی سرسوتی ٹیچر نے رام ناتھ کو ایک پوسٹ کارڈ ڈال دیا تھا اور شدید بخار میں بھی کیتکی انگلیوں پر حساب لگا رہی تھی کہ پرسوں کا ڈالا ہوا خط اگر کل مل جائے اور رام ناتھ اسی دن چل پڑے ......

نہ نہ۔ اسی دن کیسے چل سکتا ہے۔ بال بچوں والا آدمی ٹھہرا۔ انتظام کرکے دوسرے دن بھی چلے تو پرسوں یہاں پہنچ جائے گا۔ پرسوں یعنی ایک دن بیچ۔ حساب جوڑتے جوڑتے اس نے بے جان انگلیوں میں پھر پنکھا تھام لیا۔ گرمی تھی بھی ایسی کہ جی گھبرانے لگے حالانکہ چھوٹے سے پکے مکان کا یہ کچا کمرہ بڑا راحت انگیز تھا۔ اسی کمرے کو لیکر اکثر رام ناتھ بڑبڑاتا رہتا تھا کہ تھوڑے پیسے اور ہوتے تو یہ کمرہ بھی پکا ہو جاتا۔ یہ کمرہ بھی ..... جیسے کوئی دس بیس کمرے تھے۔ ایک برآمدہ۔ ایک کوٹھری، چھپر والی رسوئی، پاخانہ اور لے دے کے ایک یہ کمرہ۔ غسل خانے کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ رام ناتھ نل پر جا کے نہا لیتا۔ بڑھیا آنگن میں یونہی نہا لیتی تھی۔ اور رام ناتھ کی بہو آئی ہوئی ہوتی تو پلنگ کھڑا کر لیتی۔ اچانک ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں در آیا۔ جھونکا گرم تھا لیکن شدید حبس میں گرم ہوا بھی راحت انگیز ہوتی ہے جیسے رام ناتھ کی بہو۔ کڑوی ایسی جیسے نیم چڑھا کریلا۔ لیکن بیٹی کے ساتھ آ جاتی ہے تو گونگا گھر، دل اٹھتا ہے۔ اور چلی جاتی ہے تو یہی چھوٹا سا گھر کیسا بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ سناٹا اور اداسی مل مل کر سرگوشیاں کرتے ہیں۔ شام ڈھلے لمبے لمبے سایوں کے ساتھ جیسے بھوت بھی گھر میں اتر آتے ہیں۔ ایک اور جھونکا آیا۔ جھونکے کے

ساتھ جیسے گاتے ناچتے شور مچاتے بہت سے بچے بھی گھر میں آگئے۔ کیتکی کا بخار بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھ ذرا کی ذرا جھپکی۔ کوئی کانوں میں گانے لگا ۔۔ "کالے میگھا پانی دے۔ پانی دے گڑ دھانی دے" سب کے بیچ میں وہ لڑکی بھی تھی۔ نیچا سا پیلا اُڑا اور کم گھیر والا چھینٹ کا گھاگھرا پہنے، لمبی سی چوٹی جھولاتی۔ تالیاں بجا بجا کر گاتی ہوئی ۔۔ "بھر دے تال تلیّا رے ۔۔ پیاسی میری گیا رے۔ پیاسی میری گیا رے"۔

یہ لڑکی اکثر کیتکی کے خوابوں میں آتی تھی۔ پہلے اس کی شکل بہت صاف ہوتی تھی۔ بالکل واضح۔ اس کی آواز بھی بڑی تیز اور صاف ہوا کرتی تھی لیکن جیسے جیسے کیتکی کی عمر بڑھ رہی تھی اس لڑکی کے نقوش غیر واضح ہوتے جا رہے تھے اور آواز جیسے بہت دور سے آتی تھی مگر اس کی ایک چیز ہمیشہ بہت واضح ہوا کرتی تھی اور وہ تھی اس کے چہرے پر بھرپور مسرت کی حکمرانی۔ مسرت اس کی آواز سے بھی چھلکی پڑتی تھی اور کیتکی سوچتی تھی کہ کیا کبھی کوئی اتنا خوش رہ سکتا ہے؟

کالے میگھا پانی دے ۔۔ کالے میگھا ۔۔ نقاہت سے کیتکی کے ہاتھ کا تنکا گر گیا تھا اور وہ دھندلی دھندلی آنکھوں سے خلا میں کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔ ایک ایسا ہی کچا کمرہ ۔۔ مٹی کا فرش، اوپر موٹا چھپر، ایک کونے میں گڑھی۔ بڑی سی چکی۔ کمرے کے آگے اوسارا، باہر بندھی مریل سی گائے، چھپر پر چڑھی کدو کی بیل، ایک کیتکی جیسی بوڑھی عورت۔

"کوٹے کوٹے ڈھول بجا، دو پیسے کی سیاہی لا ۔۔ سیاہی بٹیا رانی کی، جے ہو بڑھیا نانی کی" وہ لڑکی پھر کہیں سے آگئی تھی اور تالی بجا بجا کر بوڑھی کے آگے پیچھے تھرک تھرک کر گا رہی تھی۔ ارے ہٹتی ہے کہ لگاؤں ایک ہاتھ ۔۔ بوڑھی جھنجھلائی۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنسی۔ جے ہو بوڑھی نانی کی ۔۔ جے ہو ۔۔ بلاؤں تیری ماں کو ۔۔؟ وہی تجھے ٹھیک کرے گی۔ بڑھیا پھر چڑچڑائی۔ اس مرتبہ اس کی آواز کچھ تیز تھی مگر اس میں محبت کی مٹھاس تھی۔

تیری ماں ۔۔ تیری ماں یعنی کیتکی کی ماں۔ میری ماں ۔۔ ماں ۔۔ ماں ۔۔ کیتکی کی آنکھوں کے کنارے جھریوں کا جال گیلا گیلا سا ہو گیا۔ کہیں مجھ جیسے بوڑھے لوگوں کی ماں ہوا کرتی ہے۔ میں جو پہلے ماں بنی اور پھر نانی، اور دادی ۔۔ مگر وہ جو تھی کھچڑی بالوں والی، لال پھولوں

والی کُرتی اور لال کناری کی دھوتی پہنے، بڑا سا ٹیکہ لگائے، پیتل کی تھالی میں پھول اور سندور رکھ کر مندر جاتی اور اس کی بھی جو ماں تھی وہ بوڑھی —— بغیر بلاؤز کے خالی ساڑی لپیٹے دبتی اور مہین کپڑے کے نیچے سے اس کی لمبی سوکھی چھاتیاں ایسی لگتی تھیں جیسے چھپر کی بیل سے لٹکے وہ سوکھے کدّو جنھیں ماں بچوں کے لئے چھوڑ دیا کرتی تھی۔ جے ہو بوڑھی نانی کی —— بڑھیا نے کھسیا کر ڈنکھا اٹھا کر مار دیا تھا اور وہ لڑکی روتی ہوئی لال پھولوں کی کُرتی والی عورت سے لپٹ گئی تھی —

"بوڑھے لوگوں سے چھیڑ خانی نہیں کرتے بیٹا" وہ اس کا سر چومتی ہے۔ وہ اُس، وہ نرم گرم بھرے بھرے جسم کے درمیان سمٹ چھپا کر خود کو تمام آفات سے محفوظ سمجھنے کا سہانا احساس ——

ماں —— میری ماں —— بوڑھی کیتکی بے آواز رونے لگی تھی۔

ماں کیتکی کو بے انتہا چاہتی تھی لیکن جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھتی کیتکی چھاتی سے بندھا ایسا پتھر بن گئی تھی جو کچھ دن اور بندھا رہ جاتا تو ماں بیچ دریا ڈوب کر تہہ میں بیٹھ جاتی۔ ماں ہی کیوں، باپو اور دونو بڑے بھائی اور نانی —— سب کے سب۔ اس لئے انھوں نے مل کر کیتکی کو دُکھی رام سے بیاہ دیا اور اپنے حساب سارے دکھوں سے نجات پالی۔ لیکن رخصت ہوتے وقت وہ سارے دُکھ ایک بڑا سا آکٹوپس بن کر کیتکی کے کندھوں پر پنجے گاڑ کر بیٹھ گئے —

دُکھی کی ایک بوڑھی ماں تھی۔ بوڑھی اور چڑچڑی۔ دو کنواری بہنیں تھیں جن کے بیاہ کرنے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جسے پڑھنے اور لڑنے دونوں کا شوق تھا۔ اور پھر —— تلے اوپر پیدا ہو جانے والے چار بچے تھے۔ سب سے بڑا یہی رام ناتھ پھر دوسرا جو نام کرن سے پہلے ہیُوا کہلاتا تھا، مر گیا، تیسری وِدّیا اور چوتھی مُنیا۔

دُکھی اور اُس کی ماں دونوں کیتکی کو حسبِ توفیق باری باری پیٹتے۔ جب جس کی باری ہوئی اور جیسا موقع ہوا۔ رام ناتھ پیدا ہوا تو ماں بڑی خوش ہوئی کہ پہلوٹھی کا بیٹا ہوا تھا۔ پھر ہیُوا پیدا ہوا تو کچھ دن دُکھی بھی خوش رہا کہ بیٹے کی پیٹھ پر بیٹا پیدا ہوا تھا۔ مگر پھر ہیُوا مر گیا اور وِدّیا پیدا ہو گئی۔ وِدّیا کے بعد مُنیا پیدا ہوئی تو دونوں ماں بیٹے نے مل کر

اسے زچہ خانے میں ہی مارا کہ دوسری بیٹی کیوں پیدا ہوئی جیسے بیٹی کو اپنے ہاتھ سے گڑھ کر اس نے دکھ میں ڈالا تھا اور وہ دکھی جو تھا وہ تو نامرد تھا سراسر۔ کیتکی چکی پر گیہوں پیستی یا چبوترے پر جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لیکر بیٹھی ہوتی تو بھوکی کیلی منیا گٹھری بنی روتی رہتی۔

"بڑا اگلا پچھاڑتی ہے حرام جادی، جیسے ساری یہ تھی اسی کے دم سے گھر میں آنے والی ہے،" دکھی کی ماں بڑبڑاتی۔ گیہوں، جھوٹے برتنوں، منیا کے رونے اور بڑھیا کے گالیوں کے بیچ گھری کیتکی اس لڑکی کو بھول گئی جس کے چہرے پر مسرت دھوپ کی طرح اٹکھیلیاں کرتی تھی اور ـــــ اور اب تو اس کی اپنی بیٹیاں بڑی ہو رہی تھیں۔

"ارے حرام جادی! مارتی کیوں نہیں اپنی لاڈلی کو ـــ دیکھ کرتوت اس کی" دکھی کی ماں بہو اور پوتی دونوں کے لئے ایک ہی اسم صفت استعمال کرتی تھی۔ بڑھیا نے مہوے چن چن کر ڈلیا بھری تھی سکھانے کو اور دونوں لڑکیاں ڈلیا میں سے سنہرے تازے رس بھرے مہوے مٹھی بھر بھر کر کھا رہی تھیں۔ "بالکل ماں کی جیسی چٹوری جیان ہے دونوں کی" بڑھیا بھر بھراتی اور کیتکی ماتھے تک آئے ہوئے آنچل کے تلے سے آنکھیں اٹھا کر دیکھتی۔ آلو روٹی یا صرف دال چٹنی کھاتے کھاتے اس کی زبان سے ذائقے کی حس فنا ہو چکی تھی۔ کئی بار یاد کرنے پر بھی اسے اس کھیر کا ذائقہ یاد نہ آتا جو اس کے میکے کی گائے کے دودھ سے بنا کرتی تھی۔ دکھی اکثر تاڑی کے ساتھ پیاز کے پکوڑے اور کبھی کبھی کلیجی کھا کر آتا تو دال روٹی اور آلو کی تھالی اٹھا کر پھینک دیتا تھا۔ تب دکھی کی ماں بہو کو ہزاروں صلواتیں سناتی ہوئی اٹھتی اور جب تک دکھی کیتکی کو پیٹتا وہ بیسن میں پیاز اور ہری مرچ ڈال کر موٹی چپٹی روٹیاں پکاتی جن پر ذرا سا کڑوا تیل بھی چپڑ دیا جاتا تھا۔ پھر وہ مصرانی کے یہاں سے تھوڑا سا آم کا میٹھا اچار مانگ لاتی۔ دکھی گرم گرم روٹیاں کھا کر پلنگ پر آتا تو کیتکی کی کوٹی ہوئی ہڈیاں ٹٹولنا شروع کرتا تھا۔ ادھ مری بھوکی کیتکی میں کوئی حرکت نہ پیدا ہوتی تو وہ بڑی نفرت سے کہتا "عورت ہے کہ مری بچھیا" اور کیتکی سوچتی کہ وہ اسے مری بچھیا سمجھ کر ہی چھوڑ دے مگر بھوکا آدمی سب کچھ کھا جاتا ہے اور تاڑی پی کر دکھی کی بھوک کچھ زیادہ ہی کھل جایا کرتی تھی۔

دُکھی کروٹ بدل کر سو جاتا تو بھی کیتکی جاگتی رہتی وہ اپنا دبلا پتلا جسم سمیٹ کر جھلنگی کھاٹ کے ایک کونے میں سکڑ جایا کرتی اور تب اس کی کھلی آنکھوں کے سپنوں میں وہ لڑکی در آتی کبھی مٹّی کے کوزے میں گھسی ہوئی برف پر ہرا، لال شربت ڈال کر چوستی ہوئی، کبھی چھت پر چڑھ کر پڑوس کے گھر سے جھک آئی بیری کی شاخوں سے کھٹّے میٹھے بیر توڑتی ہوئی ــــ ہے رام کون تھی وہ ؟ کیا کبھی کیتکی سے اس کا کوئی ناتا تھا ؟ کیسے خوش رہ لیتی تھی وہ اتنا ؟ شاید وہ کیتکی کے جسم کا کوئی ایسا حصّہ تھی جو اب اس کے لئے بیکار ہو چکا تھا اور اُسے کاٹ کر دور پھینک دیا گیا تھا۔ ماہ وسال بل بل کر اس کی قبر پر مٹّی ڈال رہے تھے اور مٹّی کا ڈھیر اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیسے کبھی کبھار مٹّی کاٹ کر وہ نکل آیا کرتی تھی اور کسی بے چین روح کی طرح کیتکی کے گرد تھوڑی دیر چکّر کاٹ کر پھر مٹّی کے ڈھیر کی طرف لوٹ جاتی۔

دونوں لڑکیوں کے بیاہ کو لے کر جھینکتی بوڑھیا ایک دن ختم ہو گئی لیکن کیتکی نے آنسو بھری آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر جو خاموش دعا کی تھی اس کے سہارے دونوں کے بیاہ بڑی آسانی سے ہو گئے۔ دُلّیا کو جگن ناتھ خوشی خوشی بیاہ لے گیا۔ گو اس کی پہلی بیوی مر چکی تھی مگر ابھی وہ جوان تھا اور کیتکی کو سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ وہ تاڑی نہیں پیتا تھا۔ دُلّیا تھی بھی بڑی سگھڑ اور خاموش طبع۔ مُنیا کے بڑے ہونے تک رام ناتھ کمانے لگا تھا اور مُنیا بڑی خوبصورت نکلی تھی۔ اس کی شادی ریلوے کے ایک بابو سے ہو گئی تھی۔ صورت دیکھ کر ان لوگوں نے جہیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ صرف ایک سائیکل مانگی تھی اس لیے کہ لڑکے کو دفتر جانے میں تکلیف ہوتی تھی رام ناتھ نے قسطوں پر لے کر دے دی۔ کیتکی کو اطمینان تھا دونوں لڑکیاں اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ اس کا یہ دُکھ کہ وہ انہیں کبھی بُلا نہیں پاتی، اسی اطمینان کے سہارے کٹ جاتا تھا۔ دُکھی زہریلی شراب پی کر کب کا مر کھپ چکا تھا اور رام ناتھ کو ایسے دور دراز گاؤں میں نوکری ملی تھی کہ وہ بھی شاذ و نادر ہی آتا۔ اکیلی کیتکی کو دُکھی کے اجداد کی وراثت، یہ چھوٹا سا نیم پختہ مکان کسی ڈھنڈار حویلی جیسا معلوم ہوتا۔ خاص کر شام کے دھندلکے میں، جب پڑوس کے نیم پر کوّے شور مچاتے اور چمگادڑیں اڑ کر کانوں

سے ٹکرائیں ۔

——— " چھوٹا بھی اب خوب بولتا ہے ۔ ماسٹر کے بابو جی کہتے ہیں اسے خوب پڑھائیں گے "۔ منیا نے کسی سے لکھوایا تھا ۔ کیتکی کے دل میں ہوک سی اٹھی ۔ کاش وہ سب کو بلا سکتی ۔ گھر میں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی ۔ چار بچے وِدّیا کے، دو سگے دو سوتیلے، تین رام ناتھ کے اور تین منیا کے ۔ ساری زندگی آرزوؤں میں کٹ گئی ۔ اس کی ماں بھی اسے کون سا بلا سکی تھی ۔ شادی کے بعد بس گن کر دو بار ۔ پھر وہ کیتکی کو دیکھنے کی آرزو لیے ہی چل بسی ۔ ماں ——— میری ماں ۔ آدھی جاگی آدھی سوئی کیتکی کے منہ سے بے ساختہ نکلا ۔ پھر اچانک وہ چونک پڑی اور پورے ہوش میں آ گئی ——— اس کی ماں اب کہاں تھی ۔ وہ جو خود ایک بھرے پڑے خاندان کی نانی تھی اور دادی بھی مگر دادی نانی بن جانے سے خواہش کہیں دم توڑتی ہے، پھر سے چھوٹا بن جانے کی، اس سکھ بھری دنیا میں لوٹ جانے کی جہاں ہر غم کا مداوا ماں کی نرم گرم چھاتی تھی ۔ باورچی خانے کے دھوئیں اور مرچ پیاز کی پسینے میں ملی مہک بھری میلی سی ساری کا وہ آنچل، وہ شفیق مسکراتا چہرہ ——— برسو رام دھڑاکے سے ——— برسو رام دھڑاکے سے ۔ لڑکی دھڑا دھڑ جیٹھڑوں کی گڑیا کو پیٹ رہی ہے ۔

اچانک جیسے کوئی خواب سے چونکے ۔ کیتکی کو لگا یہ تو دروازہ کھڑکنے اور بچوں کے دوڑنے کی آواز تھی ۔ وہ اپنی ساری قوت جمع کر کے اٹھ گئی ۔ دھندلی آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجہ بنا کر دیکھا کہ یہ سچ ہے یا جھوٹ ۔ رام ناتھ آ گیا تھا ۔ ساتھ میں بہو بھی تھی اور تینوں بچے بھی ۔ کیتکی نے چارپائی پر سے اترنا چاہا مگر سر چکرا گیا ۔ رام ناتھ نے دوڑ کر اسے شانوں سے پکڑ لیا ۔ کیتکی نے بچوں کی طرف اشارہ کیا ۔ بچے آکر اس سے چمٹ گئے ۔ دادی ! دادی ! بہو پلاسٹک کی ٹوکری سے کچھ پڑیاں نکال کر رسوئی کی طرف چلی گئی ۔ کیتکی بچوں کو لیے ہوئے بستر پر گر سی پڑی ۔ اس کی دھندلی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں مگر وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی ۔ رام ناتھ کے سہمے سہمے بچوں کو چمٹائے شاید وہ پھر اسی پھوس کے چھپر تلے جانے کا خواب دیکھ رہی تھی جہاں کونے میں ایک چکی تھی، اوسارے

میں گائے تھی اور بوڑھی نانی کدّو کی بیل سے کدّو اتار رہی تھی ۔ بلغم بھرے خرخر کرتے سینے، جھرّیوں دار چہرے اور گدلی آنکھوں والی کیتکی کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے ۔

رام ناتھ اس پر جھک گیا ۔ کیا کہتی ہو ماں ؟ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے ؟ جاتی گئی ہے چلئے بنائے ۔ جواب نہ پا کر رام ناتھ بے قرار سا ہو گیا ۔ گلے میں جیسے کوئی بھاری چیز پھنس گئی تھی ۔ اس نے کان کیتکی کے ہونٹوں کے قریب کر دیئے ۔ وہ دھیرے دھیرے گا رہی تھی ۔ کالے میگھا پانی دے ۔ کالے میگھا پانی دے ۔

رام ناتھ کی بہو چائے کا گلاس لیکر رسوئی سے آ گئی تھی اور شوہر کو جھکا دیکھ کر خود بھی غور سے سننے لگی تھی ۔ جھلا ہٹ دبا کر دھیرے سے بولی ۔ ارے اس وقت تو بھگوان کا نام لو ماں ۔ پھر اس نے بچوں کو ہولے سے پرے ہٹا دیا ۔ کیتکی کی مدھم ہوتی ہوئی سانس بند ہونے لگی ۔ کھلی آنکھیں دھیرے دھیرے مندنے لگیں ۔ آنسو پونچھتا رام ناتھ دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا ۔ آخری وقت میں اماں کا دماغ الٹ گیا ہے ۔ وہ تاسف بھری گہری سوچ میں ڈوب گیا ۔

○

تیسری راکھی

ارونا نے پھٹی پھٹی نظروں سے ستیش کی طرف دیکھا۔ اسے نہ آنکھوں پر یقین آرہا تھا نہ کانوں پر۔ ستیش کا مضبوط، لانبا، گندمی ہاتھ اب بھی اس کی طرف بڑھا ہوا تھا جس کی مٹھی میں ایک چمکیلی راکھی دبی ہوئی تھی۔

لو نہ بھئی —— اس نے ہنس کر پھر کہا۔ تمہارے درجن بھر بھائی گھر میں ہی موجود ہیں۔ میں نے سوچا شاید کوئی راکھی بچی نہ ہو اس لئے میں خود ہی لیتا آیا۔ چلو باندھو جلدی۔

ارونا نے اپنی گھنی سیاہ پلکیں جھکائیں جو اچانک امنڈ آنے والے آنسوؤں سے کچھ بوجھل ہو اٹھی تھیں۔ "یہ راکھی کی توہین ہے" اس نے کہنا چاہا مگر آنسو راستہ نہ پاکر حلق میں اترنے لگے تھے اور اس کے گلے میں پھندا پڑ گیا تھا۔

نہیں باندھو گی۔ ستیش اچانک سنجیدہ ہو اٹھا اس کے چہرے پر بے نیازی تھی۔ ابھی ہنسنے سے اس کے چہرے پر جو نرم سا نقاب تھا وہ سرک گیا تھا اور وہ اندر سے پتھر، روکھا اور بے رحم چہرہ نکل آیا تھا۔ راکھی کی توہین سے زیادہ ارونا کو اپنی توہین کی برداشت نہ تھی۔ اس نے ستیش کے ہاتھ سے راکھی لے لی اور چوڑی بالوں بھری کلائی پر باندھ دی۔

گڈ گرل —— ستیش نے اس کا شانہ تھپکا اور سَو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ محبت کے رشتوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ارونا۔ ان کے بہت سے روپ ہوتے ہیں۔ تن کا رشتہ ضروری نہیں۔ پیار تو من کی چیز ہے۔

ارونا کو محسوس ہوا وہ اسکول ٹیچر ہے اور ستیش اس کے سامنے اپنا ہوم ورک دُہرا رہا ہے۔ کتاب سے خوب اچھی طرح یاد کیا ہوا کوٹیشن۔ کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مار کر اس کی غنودگی کا غلاف پھاڑ دیا اور اندر سے ایک نارمل ارونا باہر نکل آئی۔ حسّیت اور ہوشیار، گرد و پیش سے باخبر۔ زندگی نے خود اس سے ہی دو غلا رویہ جائز رکھا تھا اور ستیش زندگی کا ایک حصہ تھا اشوک کی طرح۔

کوئی تین برس گزرے اشوک سے اس کی شادی ہوئی تھی اور اب طلاق کو بھی سال بھر گزر چکا تھا۔ اشوک کو "صحیح" کرنے کے سارے جتن پورے کر کے کنواری ارونا گھر لوٹ آئی تھی۔ عدالت نے شادی کو فسخ کر دیا تھا۔ اشوک شادی کے لائق ہی نہیں تھا۔ گھر والوں کے دباؤ میں آ کر اس نے شادی کی تھی۔ پھر یہ سوچ کر بھی کی تھی کہ شاید بیوی یونہی ساتھ دے جائے اور اس کا بھرم رہ جائے مگر ارونا نے اس طرح کے کسی سمجھوتے سے انکار کر دیا تھا۔ سب نے طعنے دیئے تھے۔ بڑی چاچی پیش پیش تھیں۔ سیتا ساوتری کا زمانہ گزر گیا جی جب پتی پرمیشور ہوتا تھا۔ اچھا بھلا آدمی تھا۔ خوبصورت کماؤ۔ ایک جسم ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا دنیا میں۔ ارونا کسی سے کچھ نہیں بولی تھی۔ اس دنیا کے ساتھ مشکل ہے کہ بولنا سب چاہتے ہیں، سمجھنا کوئی نہیں۔ پھر ہر ایک کو پکڑ کے یہ سمجھانا کتنا مشکل تھا کہ اشوک کے جسم سے زیادہ اس کا ذہن بیمار تھا انتہائی مشکوک، حاسد، ضدی، چڑچڑے اور غصہ ور اشوک کے ساتھ اس نے دو سال کس طرح گزارے یہ پوچھنے کی زحمت کسی نے گوارہ نہیں کی۔

اب کسی نے سمجھا تھا یا سمجھنے کا ڈھونگ رچایا تھا تو وہ ستیش تھا۔ ارونا کی آنکھیں دوبارہ سپنے بُننے لگی تھیں۔ ایک دھوکا کھانے کے بعد وہ خود بھی ٹھوک بجا کر دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اس لیے ماں اور چاچی کی زہر اُگلتی زبانوں کے باوجود وہ ستیش کے ساتھ گھومتی پھرتی۔ آئس کریم، گول گپّے، نمکین کاجو کھاتے اور خوش گپّیاں کرتے چھ مہینے گزر گئے اور ایک دن وہ اوپن ائر (Open Air) ریستوراں کی ایک الگ تھلگ سی میز پر کافی سپ کرتے ہوئے ستیش نے ارونا کے چہرے پر آئی ہوئی گھنے بالوں کی ایک لٹ ہٹاتے ہوئے کہا تھا ارونا۔

میری ماں آنے والی ہیں۔ تم ان سے ملوگی تو بہت خوش ہوگی --- اور ارونا نے مان لیا تھا کہ متوسط طبقے کے ہندوستانی لڑکے یوں ہی 'پرپوز' کیا کرتے ہیں ۔ وہ ماں سے ملے بغیر ہی خوش ہو گئی تھی - ایک گھر بسے گا، چند پھول کھلیں گے۔ آس پاس کے لوگوں کی زہر اگلتی زبانیں خاموش ہو جائیں گی ۔ لیکن ابھی ارونا کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی کہ راکھی کا تہوار آیا تھا اور ستیش نے اس آنکھوں میں جلتے سارے دیپ ایک پھونک مار کر بجھا دیئے تھے ۔

ستیش کی ماں بہت دنوں سے ستیش کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں اور اس بار وہ بات کو پکی کر کے ہی آئی تھیں ۔ ستیش نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ شادی ان کی پسند کی لڑکی سے کریگا ۔ مگر اسے امید نہیں تھی کہ ماں اتنی جلدی سب کچھ کر ڈالیں گی ۔ اب جلدی میں ارونا سے پیچھا چھڑانے کی سب سے کارگر ترکیب یہی تھی کہ جھٹ سے اسے راکھی باندھ دے ۔

آفس میں ستیش کی منگنی کی مٹھائی کھاتے ہوئے کھنہ نے آنکھیں گول گول کر کے کہا تھا مگر یار وہ ارونا ۔

She is a good sport - اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔ مجلسی لڑکی ہے، خوب ہنستی بولتی ہے جہاں کہو ساتھ جانے کو تیار ۔ مگر اب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں جھوٹی تھالی پر بیٹھ جاؤں۔

زندگی کے اکھاڑے میں تقدیر کے ہاتھ نے ارونا کو دوسری بار پٹخا تھا مگر وہ مٹی جھاڑ کر آستین چڑھا کر اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس نے آنسو پونچھ لئے ۔ ستیش کی شادی میں کھلے دل سے شرکت کی اور کھنہ نے اس کے آنسو جذب کرنے کو اپنا شانہ پیش کیا تو شکریے کے ساتھ قبول کر لیا ۔

اماں تک رپورٹ پہونچی تو انھوں نے بڑی گالیاں دیں ۔ ارونا کی شادی سے پہلے وہ اس کی شادی کے ارمان میں مری جاتی تھیں اس کا منھ دیکھ کر جیتی تھیں لیکن اس کے طلاق لیکر چلے آنے کے بعد چنڈی کا روپ بن گئی تھیں ۔ چاچی کے طعنے سن کر جو غصہ انہیں چاچی پر آتا تھا اسے بھی وہ ارونا پر اتارتی تھیں ۔ بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ کنبے میں چاچی سے کمزور پڑتی تھیں اور ارونا ان سے بھی کمزور تھی ۔ اور یہ دنیا کا دستور ٹھہرا کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے یا کم از کم

کھلنے کی کوشش ضرور کرتی ہے اس لئے ارونانے سب کو معاف کر دیا تھا - وہ اپنے گرد ایک حفاظتی دیوار کھڑی کرنے میں مصروف تھی۔ سرد و گرم ہواؤں سے محفوظ رکھنے والی خوشیوں کو اکٹھا کر کے رکھنے والی کہ وہ پھر سے اُڑ نہ جائیں مگر دیوار کھڑی کرنے کے لئے اسے خود ہی گارا بنانا تھا، خود ہی اینٹیں اکٹھا کرنی تھیں اور پھر خود ہی اُنھیں چُننا تھا۔

پورے خاندان کی ناک کٹوادی حرافہ نے ـــــ ایک کے ساتھ کھائی کھیلی، اسے بھائی بنالیا - اب اسے کیا بنائیگی باپ ؟ کہہ اس سے شادی کرنا ہو تو سیدھی طرح کرلے نکیل پکڑ کر گھما کیوں رہا ہے ؟

مگر ارونا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کھنہ خود ہی شارٹ کٹ پر اتر آیا۔ دُرگا پوجا کے موقع پر آفس چار دنوں کے لئے بند ہو رہا تھا۔ کافی ہاؤس میں ڈوسہ کھاتے ہوئے ارونا کے چہرے پہ آئی لٹ کو ہٹاتے ہوئے اس نے کہا ـــ "ارونا چلو آگرہ چلتے ہیں"

آگرہ کیا کرنے ؟ ـــ ارونا ذہین ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی بالکل گاؤدی بن جایا کرتی تھی۔ کیا کرنے ؟

ارے تفریح اور کیا ـــ اب یہ بھی سمجھانا ہوگا ؟

ماں اور چاچی سے کیا کہوں گی ـــ کیا یہی کہ شادی سے پہلے ہنی مون منانے جا رہی ہوں ؟

بس اماں کے پلّو سے بندھی رہو اور کرتی رہو جوانی غارت ۔

میں ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی ہوں اور اب تک تمہیں شریف ہی سمجھتی تھی ۔

شریف خاندان کی شریف لڑکیاں شوہر کو صرف اس لئے طلاق دیکر گھر نہیں آجاتیں کہ اس کا جسم ناکارہ ہے اور پھر ایرے غیرے لڑکوں کے ساتھ بے مقصد نہیں گھومتیں ۔

غیر ارادی طور پر ارونا کا اٹھتا ہوا ہاتھ یکایک نیچے گر گیا اس نے محض اٹھ جانے پر اکتفا کی - دروازے سے باہر جا کر زور سے تھوکا لیکن پھر پلٹ آئی ۔

میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے بہت جلد اپنی ذات جتادی - اگر کچھ دن اور یونہی بھرم میں رکھتے تو میرے اوپر کیا ری ایکشن ہوتا ؟

تمہاری مرضی ـــ کھنہ شانے اُچکا کر بولا - اگلی راکھی میں بھی راکھی لیکر حاضر ہو جاؤں گا -

ارونا دھیرے دھیرے باہر نکل گئی - گئی رات تک وہ یونہی بے مقصد گھومتی رہی یہاں تک کہ دوکانوں کے شٹر گرنے لگے اتنی دیر تک وہ کبھی گھر سے باہر نہیں رہی تھی - گھر پہونچی تو وہاں طوفان آیا ہوا تھا - ماں دروازے پر پھیلی بیٹھی تھیں - سب کا متفقہ خیال تھا کہ ارونا کہیں بھاگ گئی ہے - چھوٹا بھائی اسٹیشن گیا ہوا تھا - چاچی نے ہی اسے دوڑا دیا تھا -

ماں ایک لفظ نہیں بولیں - بھاری بھر کم جسم کے پورے وزن کے ساتھ انھوں نے اس کے چہرے پر اتنے تھپیڑ مارے کہ خود انہیں گنتی یاد نہ رہی - تھک ہار کر وہ وہیں دھب سے زمین بیٹھ گئیں اور رو رو کر بین کرنے لگیں - اپنے مرحوم شوہر کو خوب کوسا کہ وہ بے وقت کیوں مر گئے نہ مرتے تو ارونا یوں بے نتھا سانڈ نہ بن جاتی -

چاچی کا خیال تھا کہ ارونا پچھلے جنم میں راکششی تھی - کسی اچھے کرم کی وجہ سے انسان کی جون میں آگئی تھی لیکن اس کی پچھلی زندگی کی عادتیں اس کے نئے جنم پر اپنا پرتو ڈالتی رہتی تھیں اسلئے جب ان کا چھوٹا بھائی چھ سات برس پر انگلینڈ سے لوٹ کر ان سے ملنے آیا تو انھوں نے ارونا کے خلاف پورا محاذ کھول دیا - کہیں وہ ان کے بھائی کے گرد اپنا جال نہ پھیلانے لگے - کرموں جلی تھی کیسی موہنی - انگلینڈ میں نریندر رہے - جو بھی گل کھلائے ہوں مگر تھا تو کنوارا - اور پھر جیولاجی میں اعلامگری لیکر آیا تھا - چاچی نے اس کے لئے رائے خاندان میں لڑکی دیکھ رکھی تھی، شیشے کی بنی، کونونٹ میں پڑھی - کہیں اس منہ جلی ارونا نے کوئی گل کھلایا تو رائے صاحب ضرور رُسن گن پالیں گے - قریب ہی تو رہتے تھے، رائے صاحب سونے کی کان تھے - یوں نریندر کو پیسے کی کمی نہیں تھی مگر پھر بھی دنیا بھی تو دیکھے کہ بہو کیا لائی ہے اور نریندر کی شادی کہاں ہوئی ہے - اسی لئے چاچی نے زبان پر سان رکھوالی تھی اور زہر کے سوتے کھول دیئے تھے -

نریں ارونا کی ماں سے بات کر رہا تھا -

دیدی آپ اچھا سا لڑکا دیکھ کر ارونا کی شادی کر دیجئے - اس کے ساتھ سخت

بے انصافی ہوئی ہے۔

کنواریوں کو بَر ملتے نہیں بیٹا - اس سے کون کرے گا - ماں رونے لگیں۔

بَر تو مل جاتا - چاچی نے لقمہ دیا - مگر وہ خود کسی ایک کی ہو کر رہے تب تو - اور انھوں نے اروناکی ماں کے سامنے ہی تفصیل سے اس کی آوارگی کی داستانیں بیان کرنا شروع کر دیں۔

پر ڈیڈی —— آپ جن لوگوں کا نام لے رہی ہیں وہ آپ کے کہنے کے مطابق اس کے آفس کے لوگ ہیں —— مردوں کے ساتھ کام کرتی ہے تو ان کے ساتھ ہنسنا بولنا پڑے گا ہی کبھی ایک کپ چائے بھی پینی پڑ جائے گی۔

سات سمندر پار جا کے تو بھولا ہی رہا - چاچی بولیں - انھوں نے نمک مرچ لگا کر طلاق کا قصہ بیان کیا۔

بہت اچھا کیا ڈیڈی —— مجھے بڑی خوشی ہے - اب ہندوستان میں بھی ایسی ہمت والی لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں - چاچی نے سر پیٹ لیا۔

نریندر کوئی پندرہ دن وہاں رہا - اب اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے - ارونا اس سے بہت کم بات کرتی تھی مگر اس کی خاموش آنکھوں نے نریندر سے کیا کچھ کہا تھا کہ اس نے ایک دن گھر میں بم گرایا —— ڈیڈی میں ارونا سے شادی کرنے کو تیار ہوں - بڑی ہمت والی لڑکی ہے - بڑی سوئیٹ اور بے حد ذہین - میرے لئے بہترین ساتھی ثابت ہوگی - وہ شوکیس میں سجائی جانے والی گڑیا مجھے نہیں چاہیئے رائے صاحب والی۔

چاچی پھرکی کی طرح ناچنے لگیں - چاچا جو ہمیشہ چاچی سے ڈرتے تھے اور آج تک انہیں کی وجہ سے ارونا کی محبت کے باوجود اس کے لئے کچھ نہ کر سکے تھے اخبار کے پیچھے دبک گئے - ماں ہنومان چالیسا پڑھنے لگیں۔

نریندر کھڑا ہنس رہا تھا —— ارے ڈیڈی ذرا بس بھی کرو - کون سا آکاش پھٹ پڑا - ارونا غریب تو مجھ سے بات تک نہیں کرتی - یہ میرا اپنا فیصلہ ہے - یقین مانو ڈیڈی میں اس کے ساتھ بہت خوش رہوں گا —— وہ رائے صاحب کی بیٹی تو تمہیں ایسا گنی کا ناچ

نکلے گی کہ ......

اپنے کمرے میں کھڑی اردنا تھر تھر کانپ رہی تھی - نریندر نے اسے ہمت والی کہا تھا مگر اشوک پھر ستیش اور پھر کھنہ ان تینوں نے اس کی ہمت نوچ لی تھی - اس نے جھرجھرا اپنی لال کناری کی ساڑی کا کنارا نوچ ڈالا اور مٹھی میں دھاگے دبائے نریندر کے بالکل پاس پہونچ گئی -

نریندر بھیا —— آپ چاچی کے بھائی ہیں رشتے میں میرے ماموں ہوئے پر آج راکھی نہ ہوتے ہوئے بھی یہ لال دھاگا باندھ کر میں آپ کو بھائی بناتی ہوں - آج سے میری ہمت آپ ہیں -

اس نے نریندر کے پیر چھوئے پھر اپنے کرتے کی آستینیں چڑھائیں جیسے زندگی سے تنہا نبرد آزما ہونے کے لئے ہمت اکٹھا کر رہی ہو -

○

ٹوٹا ہوا خط

برگد کے پیڑ پر چڑیاں شور مچانے لگی تھیں۔ شام دھیرے دھیرے پیڑوں سے ہوتی ہوئی آنگن میں اُتر رہی تھی۔ بسیرا لینے کا وقت۔ گھر واپس آنے کا وقت۔ دیوکی نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے ٹھنڈا حقہ دھنیے کی کیاری کے پاس اُلٹ دیا۔ پھر وہ وہیں بیٹھ کر ایک تنکے سے زمین کریدنے لگی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ اس نے باریک کپڑے کی دھوتی کو شانوں کے گرد کس کر لپیٹ لیا۔ دھوتی جب خریدی گئی تھی تو خاصی گاڑھی تھی لیکن تین ساون دیکھنے کے بعد دھل دھل کر پتلی ہو گئی تھی دو چار جگہ چھید بھی ہو گئے تھے۔ اشوک نے ہر مہینہ بھیجے جانے والے پیسوں کے ساتھ پچیس روپے فاضل بھیجے تھے اور لکھا تھا ماں یہ روپے کپڑوں کے لیے ہیں۔ یہاں اچھی کناری دار دھوتی نہیں ملتی ورنہ دھوتی ہی بھیج دیتا۔ وہاں خرید لینا۔ دیوکی نے یہ روپے گولک میں ڈال دیے تھے اور نئی دھوتی کی بات دل سے نکال دی تھی۔

اکڑوں بیٹھے بیٹھے اس نے پلّو ٹٹول کر دیکھا۔ پرسوں اس نے جو پوسٹ کارڈ خریدا تھا وہ تہہ کیا ہوا اس کے آنچل میں بندھا تھا۔ دو چار دن اور بندھا رہ گیا تو تہہ پر سے ٹوٹنے لگے گا۔ مگر وہ فیصلہ نہیں کر پارہی تھی کہ چودھری کے یہاں جا کر ان کی بیٹی سے کانتا کو خط لکھوائے یا نہیں۔

ٹین کا دروازہ ہوا سے کھڑکھڑا رہا تھا۔ پل بھر کو دیوکی چوکنا ہوئی۔ پھر اسی انہماک سے زمین پر لکیریں کاڑھنے لگی۔ یہاں اس وقت کوئی نہیں آئے گا۔ محلے کی عورتیں اپنے

اپنے مردوں کے آنے کا انتظار کرتی گھر میں ہوں گی۔ کچھ لوگ تو آ بھی چکے ہوں گے اور چلنے پانی میں مصروف ہوں گے۔ سامنے میدان میں کھیلتے بچے بھی گھر چلے گئے۔ چودھری کی گائے کو چرانے جو گوالا لے جاتا تھا وہ بھی اسے پہونچا گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے گلے کے گھنگھرو بجتے سنائی دیئے تھے۔ دیوکی کو کسی کا انتظار نہیں تھا۔ شوہر، جانور، بچے، کسی کا بھی نہیں۔ کسی کا انتظار نہ ہو تو شام کیسی ڈراونی ہو جاتی ہے۔ کسی دیوانی عورت جیسی، بال کھولے، پل پل کاٹ کھانے کی دھمکی دیتی اور سر بنجر دھرتی جیسی بے مصرف، کسی بیوہ جیسی اُداس۔

دیوکی نے پلو سے آنکھیں پونچھیں۔ درما جی کو مرے ایک جُگ بیت گیا تھا۔ اشوک کو ان کے مرنے سے پہلے ہی گرام سیوک کی نوکری مل گئی تھی اور ایک ویران سے گاؤں میں اس کی پوسٹنگ ہو گئی تھی۔ پوسٹنگ ہوتے ہی دیو کی بہو لے آئی تھی۔ پیروں میں مہندی رچائے، چوڑیاں اور پازیب کھنکاتی شوبھا۔ مگر وہ یہاں صرف دس دن رہی تھی۔ پھر اشوک اسے ساتھ لے گیا تھا۔ "وہاں کھانے کی تکلیف ہوتی ہے ماں"۔ اس نے کہا تھا اور دیوکی نے مسکرا کر سوچا تھا ٹھیک ہی تو ہے۔ درما جی بھی تو اسے ایسے ہی لکھنؤ لے آئے تھے۔ مکان تو ان کا ہردوئی میں تھا مگر یہاں ایک چھوٹے سے پرائمری اسکول میں ان کی نوکری لگ گئی تھی۔ ان کی ماں نے بڑے طعنے دیئے تھے۔ "نئے زمانے کے پڑھے لکھے لڑکے ہیں۔ بیوی کو چھوڑ کر کیسے رہیں گے۔ بڑے شہر میں ساتھ لیکر گھومیں گے"۔ حالانکہ یہ سعادت گنج کا علاقہ اس وقت کیسا بنجر دیہات جیسا تھا۔ اسے تو کبھی محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ بڑے شہر میں آئی ہے، چاروں طرف کچے مکان، کھپوس کے چھپّر، پتلی سی گلی کے اس پار گھر کی عین سیدھ میں ٹانگہ اسٹینڈ جہاں سے گھوڑوں اور ان کے پیشاب کی مہک ہوا کے ساتھ دن بھر گھر میں گھستی پھرتی۔ یکے، تانگے والے گالیاں بکتے۔ خالی اوقات میں میلی چادر بچھا کر تاش کھیلتے اور زور زور سے قہقہے لگاتے۔ دیوکی ڈر کے مارے گھر سے باہر جھانکتی بھی نہیں تھی۔ کیسا گھومنا اور کہاں کی تفریح۔ بس ایک بار درما جی اسے ساتھ لے گئے تھے اور چڑیا خانہ، امام باڑہ اور نہ جانے کیا کیا دکھایا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ کوئی پکچر دیکھی تھی۔ ماں سے تو درما جی نے بھی یہی بہانہ کیا تھا۔ کھانے

کی بڑی تکلیف ہے ماں، لیکن دیوکی کو یہاں لاکر بولے تھے، کھانا وانا تو بہانہ تھا دیوکی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ علاقہ ایسا بنجر اجاڑ ہے کہ یہاں دل نہیں لگتا اکیلے۔ پھر بے چارہ اشوک تو دیہات میں تھا۔ سچ مچ کا دیہات۔ وہ بھی بستی جیسے پس ماندہ ضلع میں۔ سنا تھا لکھنؤ میں بڑی اچھی اچھی جگہیں ہیں دیکھنے کو۔ سنیما ہال ہیں، ہوٹل ہیں، شاید وہ کبھی ان کے سامنے سے بھی گذری تھی لیکن اب تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کون سی جگہ کہاں ہے۔ کانتا کی پیدائش کے بعد سے وہ کہیں نہیں گئی۔ سوائے محلے اور پاس پڑوس کے ان گھروں کے جہاں مرنے، جینے، غمی خوشی کے تعلقات تھے۔

کانتا کا خیال آتے ہی اس نے پھر پلو ٹٹولا۔ دوہرا تہہ کیا ہوا پوسٹ کارڈ ایک مہین پھانس بن کر اڑا۔ اور سیدھا دل میں گڑ گیا۔ تین چار دن ہوئے کہ سامنے والے نیم میں جھولا پڑ گیا تھا۔ دن میں کنواری بالی لڑکیاں جھولتیں اور رات کو جوان بیاہتائیں بھر بھر ہاتھ دھانی چوڑیاں پہنے، مہندی رچائے کجری گاتیں۔ گئی رات تک ان کی آواز نیم کے سبز پتوں سے چھن چھن کر دیوکی کے گھر تک آتی۔ یہ ساتواں ساون تھا۔ سات برس۔ سات جُگ بیتے کہ اس کی ملاقات کانتا سے ہوئی تھی۔ تب وہ دو بچے لیکر آئی تھی۔ اس بیچ اس کے دو بچے اور ہوئے تھے۔ اب تو چھوٹا بھی بولنے لگا ہوگا اور خوب دوڑتا بھاگتا ہوگا۔ اس نے سوچا تھا اس بار وہ ضرور کانتا کو بلائے گی۔ ہر مرتبہ اُسے خیال آتا کہ شاید اگلے ساون میں وہ نہ رہے اور کانتا کو اس کے سارے بچوں کو اکٹھا دیکھنے کی آرزو دل کی دل ہی میں رہ جائے۔

کانتا ساون کے مہینے میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ اسی سامنے والے کمرے میں جو اب دیمک لگ کر بالکل دیوکی جیسا ہو گیا ہے۔ بوڑھا اور کمزور۔ خود اپنے وجود کے سائے جیسا۔ یادیں شاید ہواؤں میں تیر آتی ہیں اور پھر رگوں میں سرایت کر جاتی ہیں۔ مگر ہوا ہی میں کیوں؟ مدھم چاندنی میں رات کے سناٹے میں کسی گھر سے آتی ریڈیو کی آواز میں، پانی کی ننھی ننھی بوندوں میں نیم کے پھولوں کی نمکولیوں، آم کے بور کی خوشبو میں، کجری کی تانوں میں۔ ساون کے ساون اماں دیوکی کو گھر بلاتی تھیں تب بابوجی زندہ تھے اور بھیا کڑیل جوان تھے جیسے اب اشوک ہے۔ واپسی بھی

اس کے ساتھ آموں کی بڑی کھانچی آیا کرتی تھی اور ایک گوٹا لگی چنری اور سندیلے کے لڈوؤں کی ہانڈی۔ اگر ورما جی زندہ رہتے یا اشوک ان کے سپنوں کے مطابق کسی ذرا بڑی نوکری پر لگا ہوتا یا پھر کانتا —— مگر کانتا کے بارے میں کوئی بھی ایسی ویسی بات سوچتے ہوئے دیوکی کی سوچوں میں بریک لگ جایا کرتا تھا۔ جب وہ ننھی بچی تھی تو اکثر پڑوس میں لڑ آیا کرتی تھی۔ کوئی نہ کوئی بچہ شکایت لے کر آتا۔ چاچی دیکھو کانتا نے میرے بال نوچ لیے، کاکی اس نے میری گڑیا پھاڑ دی۔ کبھی کوئی عورت آدھمکتی۔ ماسٹرانی دیکھو کانتا کو سمجھاؤ۔ لڑکی ذات ہے۔ ایسا ہی مرچ جیسا مزاج رکھے گی تو کون بیاہ کر لے جائیگا۔ میرے سفید بالوں کا ذرا لحاظ نہیں کرتی۔ اور نرم مزاج دیوکی آگ بن جاتی تھی۔ کانتا اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ کانتا ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ نہ وہ بال نوچ سکتی ہے نہ گڑیا پھاڑ سکتی ہے نہ بوڑھی پنڈتائن سے بدزبانی کر سکتی ہے۔ وہ کانتا کو پلو تلے چھپا لیتی اور شکایت لانے والے سے خوب لڑتی۔ لوگ حیران رہ جاتے۔ بے زبان دیوکی نے لڑنا کہاں سے سیکھ لیا۔

کانتا پیدا ہوئی تھی تو اس نے مٹی کی گولک خریدی تھی۔ ہر مہینے گولک تھوڑی توڑی جاتی اور پیسے ڈاکخانے میں جمع ہو جاتے۔ یہ پیسے دیوکی گھر کے خرچ سے بچانے لگی تھی۔ ورما جی کو مچھلی کا بڑا شوق تھا۔ اب گھر میں مچھلی پکنا تقریباً بند ہو گئی تھی۔ بس ہولی کی ہولی مچھلی پکتی تھی۔ "بیٹی آگئی ہے گھر میں اس کی فکر کرو۔ بہت ہو چکی زبان کی خدمت۔" وہ کہتی اس نے خود اپنی پان کھانے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ ہر مہینے وہ اسٹیل کا کوئی برتن بھی ضرور خریدتی۔ جو سنبھال کر ٹین کے زنگ آلود ٹرنک میں رکھ دیا جاتا۔ دیوکی جس مکان میں تھی ورما جی اسے خرید لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ کچھ روپیہ انھوں نے پس انداز کر رکھا تھا مگر دیوکی نے وہ ہائے توبہ مچائی کہ گھبرا کر انھوں نے وعدہ کر لیا کہ مکان خریدنے کی بات وہ کانتا کی شادی کے بعد ہی سوچیں گے۔ تب ہی تو ریلوے کی معقول نوکری والا کھاتا پیتا خوش شکل للّو سریواستو آسانی سے کانتا کو بیاہ لے گیا۔ اب کانتا ریلوے کے دو کمروں اور فلیش لیٹرین والے صاف ستھرے کوارٹر میں رہتی تھی۔ گھر کے پیچھے چھوٹی سی بگیا

میں سبزیاں اور پھول تھے اور اس کے دونوں بچے قریب اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ ٹیبل فین اور ریڈیو کانتا جہیز میں لے گئی تھی۔ للو کو گھر گرہستی کا دوسرا سامان بھی جہیز میں مل گیا تھا۔ اپنی جمع رقم سے اس نے اسکوٹر خرید لی تھی۔ درماجی کی زندگی میں کانتا ایک دو بار چین سے آکر رہی لیکن اب آتی تو چوتھے پانچویں دن بھاگنے لگتی۔ بچوں کو تکلیف ہوتی ہے دیمک زدہ کچے مکان میں۔ انہیں کھلے میدان میں کھیلنے کی عادت ہے۔ کوارٹر کے سامنے بڑا سا پارک ہے۔ سنڈاس سے انہیں گھن آتی ہے۔ جاڑے میں وہ سب شام کو بھی چائے پیتے ہیں اور ڈبل روٹی مکھن کا ناشتہ کرتے ہیں۔ دیو کی کے کلیجے میں ہوک سی اٹھتی وقت کتنا بدل گیا تھا۔ درماجی زندہ رہتے تو بوڑھے ہونے کے باوجود بھی وہ ٹیوشن سے اچھا خاصہ پیسہ کما سکتے تھے۔ وہ حساب اور انگریزی بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اشوک جو چھبیس روپے ماہوار بھیجتا تھا اس میں سے تو دس روپے مکان کے کرایہ کے نکل جاتے تھے۔ باقی میں سے وہ کبھی پانچ بچا پاتی کبھی دو۔ آخر اپنی جان تو تھی ہی۔ بدن کو کچھ نہیں تو دال روٹی تو چاہیئے اور پھر یہ حقے کی لت۔ کانتا کی شادی کے بعد اس نے دوبارہ تمبا کو شروع کر دیا تھا۔ بڑھاپے کی لت آسانی سے نہیں چھوٹتی۔ کتنی بار چاہا کہ چھوڑ دے لیکن چھوڑتی تو پیٹ پھولنا شروع ہو جاتا۔ دوا علاج سے تو تمبا کو ہی سستا تھا۔ جب تک بھیا زندہ رہے سال کے سال ایک جوڑا کپڑا ضرور بھیجتے تھے اب وہ انتظام بھی خود ہی کرنا تھا۔ کانتا کو بلایا جائے تو رخصت کرتے وقت ایک ساڑھی دینا ضروری تھا۔ خواہ سوتی ہی ہو۔ بچوں کے ہاتھ پر پانچ پانچ روپے رکھنے بھی ضروری ہیں۔ ویسے اصولاً تو انہیں بھی کپڑے بنانے چاہئیں۔ پھر سیر سوا سیر مٹھائی ساتھ نہ کی تو داماد کے سامنے کیسی بے عزتی ہوگی۔ بچوں کی کھائی ہوئی مکھن ڈبل روٹی دیکھنے کون آتا ہے اس لئے دیو کی سن کر بھی مکر جاتی ہاں مگر تے وقت اس کے دل میں ایک ٹیس ضرور اٹھتی تھی۔ وہ اپنا گولک کانتا کے جاتے وقت ہی توڑتی تھی تاکہ ساڑھی اور لڈو خریدے جا سکیں، بچوں کو کچھ نقد دیا جا سکے۔ پچھلی بار کانتا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ "بچے چار پیسے کی مٹھائی کو ترستے رہے۔ مگر اماں تمہاری گانٹھ نہ کھلی۔ اب داماد کے آگے اونچا بننے کو ململ کی دھوتی ساتھ کر رہی ہو۔ رکھو اپنی دھوتی۔ بھگوان کی دیا سے

میرے بکس میں چھ سوتی چار ریشمی ساڑھیاں ہیں ۔

دیوکی کے دل میں کچھ ٹوٹ سا گیا (اور ایسا ٹوٹا کہ سات برس بعد بھی ٹیس باقی تھی) پانی بھری آنکھوں سے اس نے کانتا کو دیکھا ۔ یہ کانتا تو کبھی ایسے نہیں بولتی تھی ۔ اُس نے اسے گلے لگالیا تو بھی وہ اکھڑی اکھڑی سی الگ کو رہی ۔ یہ وہی کانتا تھی جو یوں ٹوٹ کر گلے ملتی تھی جیسے پھر سے ننھی بچی بن گئی ہو ۔ یہ وہی کانتا تھی جس کے لیے دیوکی نے شوہر کا واحد شوق ختم کرادیا تھا، اپنا واحد شوق ختم کردیا تھا ۔ یہ وہی کانتا تھی جسے ٹپکتے چھپر کے نیچے لیکر وہ اس طرح بیٹھی تھی کہ اس پر بوند بھی نہ گرے ۔ آنچل سے خوب ڈھک کر اور دوہری ہوکر پیٹھ کے سائے تلے لیکر اشوک سے چھپاکر گرم کے سیوئے دیتی تھی اور ملائی کی برف ۔ اور جس کے بیاہ کے لیے جلے پاؤں کی بلی کی طرح روتی روتی ساری برادری میں گھومتی پھری تھی تب جاکر شریف اور خوشحال آدمی ملا تھا ۔

کانتا چلی گئی تو گھر پھر وہی بھوتوں کا ڈیرہ ہوگیا ۔ اشوک کے اپنے بال بچے ہیں ۔ اپنی مشکلات ہیں، دور دراز کی رہائش ہے ۔ پھر اسکول جانے والے بچے ہیں ۔ چھٹیاں ہوتی ہیں تو شوبھا انہیں لیکر مایئکے جانا زیادہ پسند کرتی ہے ۔ پھر اپنا مائیکہ ہے ۔

اچانک روشنی کا ایک ٹکڑا گھر میں رینگ آیا ۔ اسٹریٹ لائٹ جل گئی تھی ۔ جب دیوکی یہاں آئی تھی — آج سے چالیس برس پہلے تو ادھر روشنی نہیں تھی ۔ اب سب گھروں میں روشنی ہے ۔ پھوس کے زیادہ تر گھر پکے ہو چکے ہیں ۔ تانگہ اسٹینڈ ختم ہوگیا ہے اس کی جگہ بس اسٹاپ بن گیا ہے ۔ بس ایک اسی کا گھر ہے کھپریل اور پھوس کا جہاں اب بھی چراغ جلتا ہے ۔ ماسٹر دین دیال ورما گھر خریدنے اور اسے پکّا کرانے کی آرزو لیے چل بسے ۔ پھر یہاں رہتا بھی کون ۔ اکیلی دیوکی ۔ جھکتی آتما سی بوڑھی دیوکی ۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اس نے کمرے میں آکر طاق سے گولک اٹھایا ۔ کھنکھنا کر اس کے وزن کا اندازہ کیا پھر ایک جھٹکے سے توڑ ڈالا ۔ اس مہینے کے پچیس ۲۵ روپے نوٹوں کی شکل میں تھے جو اشوک نے دھوتی کے لیے بھیجے تھے ۔ باقی سب سکّے تھے ۔ دو چار مڑے تڑے ایک دو روپے کے نوٹ بھی

تھے۔ دیوکی نے ایک ایک سکّہ محبت سے انگلیوں میں اٹھایا۔ کئی کئی بار کر کے گِنا۔ سارے سکّوں کی الگ الگ ڈھیریاں بنائیں۔ پانچ پیسے، دس پیسے، چونیاں، اٹھنیاں ــــ سب کو جوڑا کُل ساٹھ روپے اسّی پیسے۔ ہے بھگوان پچاس روپے سے کم کی ساڑی نہیں آئے گی۔ پھر چار بچے اور کانتا یہاں ہفتہ بھر بھی رہے تو اِن کی رہائش کا خرچ، کہیں داماد بھی ساتھ چلے آئے تو اور مشکل۔ کہنا تو ان کو بھی ہوگا۔ کانتا تنہا کیسے آئے گی پہلے تو اشوک لے آیا تھا جاکر۔

اس نے سارے پیسے واپس تکیے کے اندر رکھ دیئے۔ کل صبح وہ دوسری گولک لے آئیگی۔ سارے پیسے دوبارہ اس میں ڈال دیگی۔ شاید اگلے ساون۔ اگر جی بچ گئی تو اگلے ساون۔ اس نے پلّو ٹٹول کر تہہ کیا ہوا پوسٹ کارڈ دیکھا۔ اسے باندھے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ سونے میں گرتا ہے۔ اس نے گرہ کھولی۔ پوسٹ کارڈ تہہ پر سے ٹوٹ چکا تھا۔ دیوکی کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اُٹھا کر طاقچے پر رکھ دیا۔ جہاں پہلے گولک رکھی ہوئی تھی۔

کاغذ کا رشتہ

باہر اوسارے میں کوئی اُونچی اُونچی آوازوں میں بول رہا تھا۔ شاید بڑکو، چھوٹے اور آپا سب اکٹھے مِل کر بول رہے تھے۔ "کا ہے سب جنی سبیرے سبیرے ہلّا کرت جات ہیں" اماں نے اعتراض سے زیادہ تجسّس کا اظہار کیا اور چُولہا پھونکتے پھونکتے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ میلے دوپٹے سے ماتھے پر آئی پسینے کی بُوندیں پونچھیں اور دھواں دیتی ارہر کی جلاون کا مٹھا یونہی چھوڑ کر باہر کی طرف چل دیں۔ بڑکو کی دلہن نے گھونگھٹ اوپر سرکایا اور چُولہے کا چارج اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اماں کی تو خاص عادت تھی۔ ناتی پوتے والی ہو گئیں لیکن جہاں ذرا باہر سے کسی لڑائی بھڑائی کی آواز آئی یا عورتوں کی ٹولی گیت گاتی ہوئی گزری، وہ سارے کام چھوڑ کر یا تھ جھاڑ جھوڑ کر دوڑتیں دروازے کی طرف اور میلے ٹاٹ کا پردہ سرکا کر اس وقت تک دروازے میں اڑی رہتیں جب تک وہ واقعہ گزر نہ جاتا پھر ابّا کو کھانا کھلاتے وقت سارے دن کی روداد سُناتیں ۔۔۔ "آج رام دین کے گھر سے بدھاوا آیا رہا۔ بتوہو (بہو) کو تین بٹیو پر بیٹا ہوا ہے نا۔" یا نور محمد کی جھٹکی بہو بے جات پھر سے آئے رہیں۔

بڑکو کی دلہن گھونگھٹ میں دھیرے دھیرے مسکراتی اور مُنّو کی آنکھیں حسبِ دستور خلا میں کچھ دیکھتیں۔ نور محمد کی "جھٹکی بہو کا شوہر" یعنی بدرالدین کتنا خیال کرتا تھا اس کا، کتنا چاہتا تھا لیکن اس کی ناک ہمیشہ چڑھی ہی رہتی۔ کسی دن ساس کچھ زیادہ کہہ سن دیتیں تو اس پر دورے پڑنے لگتے۔ ہاتھ پیر اکڑ جاتے، دانت بیٹھ جاتے۔ اماں کا پختہ عقیدہ تھا کہ یہ سب جنوں

کی کرامات ہیں تالاب کے کنارے گھنے برگد پر ان کا ڈیرا تھا اور اس شیطان چھوکری نے خاص کر اسی برگد میں جھولا ڈلوایا تھا۔

منو ٹھنڈی سانس لیتی۔ اُسے اتنا چاہنے والا شوہر ملتا تو پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ لوگ کہتے ہیں جوڑے آسمان پر ملائے جاتے ہیں کون ملاتا ہے جوڑے؟ ضرور اللہ میاں نے کوئی فرشتہ مقرر کیا ہوگا لیکن کیا اس کی سُدھ بُدھ لے لی تھی جو ایسے اندھے جوڑے ملاتا تھا۔ بدرالدین جیسے نیک کماؤ لڑکے کو مل گئی یہ لوہے کے چنے چبوانے والی اور وہ جو تھی، بے زبان گائے جیسی خدمت گار، محبت کرنے والی۔ اسی کو مل گیا وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اب تو اس کا نام لیتے ہوئے بھی جیسے کوئی خیالات کے دھارے میں بڑی سی پتھر کی چٹان ڈال کر روک لگا دیتا تھا اور نام بڑی مشکل سے ذہن میں آتا تھا۔۔۔۔۔۔ ضیا۔

اماں نے ٹاٹ کا پردہ سرکایا تو جیسے انہیں کاٹھ مار گیا۔ وہ کسی دلچسپ تماشے کی امید میں دوڑی تھیں۔ شاید وہ پگلا محمد پھر مسجد میں گھس آیا تھا یا ان کے چچیرے جیٹھ کے لڑکے نے کھیت میں جاتے ہوئے پانی پر بند روک لگائی تھی اور بڑکو اور چھوٹے اس کا مزاج درست کرنے پر تلے ہوئے تھے یا یہ سب کچھ نہیں تو تالاب سے بہت بڑی مچھلی نکلی تھی۔ کئی دن سے مولوی صاحب مچھلیاں نکلوانے کی بات کر رہے تھے۔

وہاں تو یہ سب کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں تو وہ تھا۔ وہ۔ اماں نے آنکھیں ملیں۔ ہاں وہ ضیا ہی تھا۔ سر جھکائے، میلا پاجامہ پہنے۔ دھاری دار قمیص آستینوں پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ وہ چوروں کی طرح ان لوگوں کے نرغے میں گھرا کھڑا تھا اور تینوں کی آوازیں بتدریج اونچی ہو رہی تھیں۔ چشم زدن میں نور محمد بھی آ گئے۔ کسی بھی متنازعہ معاملے میں نور محمد ایسے ہی آموجود ہوتے تھے جیسے وہ جن ہوں اور چراغ رگڑ کر ان کو حاضر کیا گیا ہو۔

"ذرا صبر سے کام لیو۔ دھیرے بولو۔" نور محمد نے پہنچتے کے ساتھ ہی معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "تم الگ رہو۔" انھوں نے بڑکو اور چھوٹے سے کہا۔

"الگ کیوں رہیں چچا؟" دونوں تن کر بولے۔ چھوٹے تو اس کا گریبان تھامنے کو آگے بڑھا۔ ہائیں ہائیں کرکے نور محمد نے بیچ بچاؤ کرایا۔

اماں ابا اس اچانک لگنے والے دھچکے سے سنبھل چکی تھیں۔ وہ جو دیکھ رہی تھیں، وہ سچ تھا۔ یہ ضیا ہی تھا۔ ضیا جس نے ان کے چھوٹے سے خوشیوں بھرے گھر میں دکھ ہی دکھ بھر دیے تھے۔ ان کی معصوم اکلوتی، چہیتی بیٹی منو کی زندگی تباہ کردی تھی۔ وہ ٹھگی سی کھڑی رہ گئیں۔ بھرتے زخم کو کسی نے پھر کچوٹ دیا تھا۔

اُن کے یہاں تابڑ توڑ پانچ بیٹے ہوئے تھے۔ انعام، اکرام، شہزادہ، بڑکو اور چھوٹے۔ پہلے دو بیٹوں میں تو وہ بہت خوش رہیں۔ ان کی ساس کی نظروں میں بھی ان کی قدر بڑھ گئی تھی۔ بیٹے کی بیٹھ پر بیٹا ہوا تھا۔ لیکن شہزادہ پیدا ہوا تو وہ تھوڑا اداس ہو گئیں۔ بیٹی ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔ بیٹی ماں کا دکھ درد سمجھتی ہے۔ ہاتھ بٹاتی ہے۔ بیٹا یعنی مرد — مرد تو میدان کی چیز ہے۔ باہر باہر رہنے والا۔ بیٹی بیاہ کر چلی جائے تو بھی ماں کا درد اس کے دل سے کم نہیں ہوتا۔ بیٹے کی شادی ہوئی نہیں کہ گیا ہاتھ سے۔ بڑکو اور چھوٹے پیٹ میں آئے تو انھوں نے بیٹی ہونے کے لئے منت مانی، پانچوں پیر ن جاکر دعا کی۔ جناتوں والی مسجد کی دیوار پر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کوئلے سے اپنے دل کی خواہش لکھی تب جاکر چھٹی بار در د جھیلنے پر آمنہ پیدا ہوئی۔ بڑی بڑی آنکھوں والی گیہوں کی سنہری بالی جیسی رنگت والی آمنہ بچپن سے ہی خاموش طبیعت اور نیک مزاج۔

آمنہ کے ابا شرع کے بڑے پابند تھے۔ مولوی ٹھہرے۔ لیکن اماں نے گود میں سوئی چھ مہینے کی آمنہ کے منہ میں چھاتی دیتے وقت سوچا تھا — مولوی صاحب گانے بجانے کے سخت خلاف ہیں مگر اس کی شادی میں، ہم ضرور گائیں گے۔ سات دن ڈھولک ٹھنکے گی۔ اور ایک ایک دن گن گن کر گزارنے کے بعد سترہ اٹھارہ برس گزر گئے تھے اور وہ دن آیا تھا جب آمنہ کی شادی طے ہوئی تھی۔

اماں کونے کونے آنسو پونچھتی پھرتیں اور جب چہرہ نارمل ہو جاتا تو گاتی بجاتی عورتوں

کے بیچ آکر بیٹھ جاتیں ۔

"ارے بھوجی! سبیرے کھانے کو نہیں ملا تھا کیا؟ آواز کا یاں مار دیس ہے۔"
وہ اپنی خاص سہیلی بابو کامتا پرشاد کی بہو سے ٹھٹھول کرتیں ۔ وہ ڈھولک بجانے میں استاد تھیں ۔ گیت گانے کی اجازت مولوی صاحب سے انہیں نے دلوائی تھی ۔

اماں کے کلیجے میں ہوک اٹھی، سارے مناظر ایک سیکنڈ میں آنکھوں میں گھوم گئے تھے۔
وہ بلبلا کر گالیاں دیتی ہوئی پلٹیں ۔ "ارے داڑھی جار، بے ایمان کے پوت ۔ ابھی تم اچھے بھلے ہو ۔ مرے نا ہیں جو ہمری منو کا چھٹی ملت ۔ یا اللہ ۔ ارے دلہن ۔ ایکی ہمت دیکھو ۔ کاہے آیا ہے یہاں ___؟" وہ زور زور سے بولتی ہوئی دھواں بھرے باورچی خانے میں آئیں سان کی ایک ایک حرکت سے اضطراب ٹپک رہا تھا ۔ آنکھیں بے چین تھیں ۔

"کون اماں؟" بڑکو کی دلہن نے گھونگھٹ تلے آنکھیں اٹھائیں، کسی چھٹی حس نے آمنہ کو خبردار کیا کہ کوئی خاص بات ہے ۔ نہ جانے کیا ۔ لیکن کچھ، جو اس سے تعلق رکھتا ہے ۔ وہ ذرا سا کسمسائی ۔ باہر سے تیز آوازیں اب بھی آرہی تھیں ۔ نور محمد چچا کی بھاری آواز بھی ان میں گھل مل گئی تھی ۔ پیچھے والے آنگن میں بندھی گائے نے زور زور سے رمبھانا شروع کر دیا تھا ۔

"ارے دہی جیا ۔ ہیجہ پکڑے اُس کو ۔ گولی لگے۔"

آمنہ تڑپ کے اٹھی ۔ "کون؟ کہاں؟ کوستی کیوں ہو اماں؟ کسے کوس رہی ہو؟"
"تب کا پھول مالا چڑھائیں ۔ اُدھو کر کے دیکھ لیا۔"

بڑکو کی دلہن بھی اٹھ چکی تھی اور دروازے کی طرف لپک جھپک بڑھ گئی تھی ۔ آمنہ نے کسی اضطراری کیفیت کے تحت اماں کو کوسنے سے منع کیا تھا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی وہ بھی اُٹھ کر آگے بڑھی ۔ "ارے کہاں جائے رہی ہو منو ۔ صورت حرام کی صورت دیکھے کو۔" اماں نے پکار کر کہا ۔ مگر وہ بڑھ چکی تھی ۔ اس نے پردے میں سے جھانکا تو دل اُچھل کر حلق میں آرہا ۔ وہ ضیا ہی تھا ۔ پھٹے حال، پھٹکار زدہ، فاقہ زدہ، شیخ صلاح الدین کا بیٹا شیخ ضیاء الدین میٹرک پاس تھا ۔ گھر میں اچھی کھیتی باڑی تھی ۔ اپنا ٹریکٹر تھا سامان آبلے

تو اپنی حیثیت سے بڑھ کر گھر ڈھونڈا تھا۔ شریف لوگ تھے نہ جانے کہاں سے بیٹا ایسا آوارہ نکل گیا تھا۔ آمنہ نے اس گھر میں نہ جانے کتنی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ پھول کی چھڑی بھی جس کو نہیں چھوائی گئی تھی اس نے مار بھی کھائی۔ رضیا ایک پیا پیسہ نہیں کماتا تھا۔ کھیتوں کی دیکھ بھال اس کے لئے ہتک عزت تھی۔ نوکری کے لائق وہ تھا نہیں۔ بس لڑکیوں کے اسکول کے آگے کھڑا رہتا۔ تیری میری بیٹیوں کو چھیڑتا۔ اپنی ایک بیٹی ہو گئی تب بھی عقل نہیں۔ گھر چھوڑ کر دو مرتبہ پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ تیسری مرتبہ بھاگا تو پتہ چلا پرے گاؤں سے کسی چمار کی بیٹی کو لے کر نکل گیا ہے۔ سال بھر کوئی خیر خبر نہیں ملی تو اماں نے آمنہ کو بلا کر گھر پر ہی رکھ لیا۔ سال بھر اور گذر گیا۔ گھر والے آمنہ پر خلع لے لینے کے لئے زور دینے لگے۔ آمنہ راضی نہیں ہوئی۔ شاید کبھی عقل آئے، شاید کبھی واپس لوٹ آئیں۔ اس نے یہی سوچا۔ اس کی ویران آنکھوں کو دیکھ کر گھر میں کسی کا جی ہنسنے کو نہ چاہتا۔ بڑکو اپنی دلہن کے لئے کوئی چیز نہ لاتے۔ بچے کو سب کے سامنے دُلارتے تک نہیں تھے کہ نہ جانے آمنہ کے جی پر کیا گزرے۔ دلہن دل ہی دل میں کڑھتیں۔ اکلوتی نند سے محبت بھی تھی اور بہناپا بھی لیکن محبت اور بہناپے کی خاطر ساری مسرتوں پر روک لگانے کو کون راضی ہوتا ہے۔

شاید وہ واپس آگیا ہے۔ آمنہ نے سوچا۔ اماں کوس کیوں رہی ہیں؟ بھائی مارنے کو دوڑ رہے ہیں۔ ایک عزت دار گھرانے میں داماد کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ بھیا اور ابا کو کیا ہو گیا ہے؟

چچا! باہر بڑکو نور محمد سے کہہ رہے تھے۔ یہ اگر اپنی غلطی مانتے، اپنے ظلم کی تلافی کرنے کو کہتے تو ہم سر آنکھوں پر بٹھاتے۔

یہ آئے ہیں ..... چھوٹے کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ ..... یہ آئے ہیں روپیہ مانگنے۔

کیا حق ہے ان کا؟ شرم نہیں آتی؟ ان کی بیوی بچے کو ہم پال رہے ہیں۔ دو برس گزر گئے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

نور محمد چچا کہہ رہے تھے۔ اچھا اچھا۔ ذرا غصہ قابو میں کر کے رہو بھیا۔ ہم بات

کرتے ہیں ۔

وہ بھیا سے مخاطب ہوئے ۔ بٹیا کو لے جانے آئے ہو؟

بٹیا کو لے جانے کی استطاعت ہے ۔ ذرا اس کا حلیہ دیکھئے! یہ شیخ صاحب کا بیٹا ہے؟ تھرتھراتی آمنہ نے آنسوؤں کی چلمن کے پیچھے سے غور سے دیکھا ۔ وہ کوئی جیب کترا معلوم ہو رہا تھا ۔ یا بھکاری، فاقہ زدہ، مظلوم، غیرت حیا اور خودداری بیچ کر وہ ان لوگوں کے درمیان آیا تھا ۔

بڑکو نے آنکھیں لال کرکے اس کی طرف دیکھا ۔ چچا یہ بے غیرت مجھ سے روپے مانگ رہا تھا ۔ ہم لوگ نہ ہوتے تو یہ ہماری اکلوتی نازوں کی پالی بہن کو بھیک منگوا دیتا ۔ اس کے سارے زیور بیچ کر کھا گیا چوٹّا ۔ وہ تو کہئے ہم پانچ بھائی ہیں جو اس کی اور ہماری ننھی بھانجی کی پرورش ہو گئی ورنہ —— ورنہ بڑکو کی آواز میں غصّے کے ساتھ انتہائی رنج کی آمیزش تھی ۔

اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ یہاں آئے؟ چھوٹے تقریباً جوتا سنبھال چکے تھے ۔ شاید یہ آخری ذریعہ ہوگا جو اس نے آزمانا چاہا ۔ باپ تو پہلے ہی عاق کر چکے تھے وہ چمار کی بیٹی کو لیکر بڑی تھکّا فضیحت ہوئی تھی ۔ پنچایت نہ پڑتی درمیان میں تو خون خرابے ہو جاتے ۔ گھر والے صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے ۔ اس نے سوچا شاید سسرال والے کچھ دیدیں بیٹی کا دیا ہے ۔ سسرال والے تو نہ جانے کب سے طلاق کے خواہاں تھے آمنہ کے انکار سے مجبور تھے ورنہ لے چکے ہوتے ۔ طلاق نہ ہونے سے کاغذی رشتہ قائم تھا ۔

آمنہ نے آنکھیں میچ کر آنسو پیئے ۔ یہ اس کا شوہر تھا ۔ جب شادی ہوئی تھی تب ایسا لفنگا سا نہیں لگتا تھا ۔ کم از کم حلیہ تو درست تھا ۔ گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائی تھیں ۔ کیا کیا سہا تھا جو شرم و حیا کو طاق پر رکھ کر ان لوگوں سے پیسے مانگنے آیا تھا جن کی بیٹی کو اس نے دکھ ہی دکھ دیئے تھے ۔

جاؤ بھیّا ۔ خیریت اسی میں ہے کہ چپ چاپ لوٹ جاؤ —— نور محمد نے نرم لیکن مضبوط لہجے میں کہا ۔ پھر بڑکو اور چھوٹے کی طرف دیکھ کر بولے ۔ اور تم لوگ اپنی شرافت مت بھولو ۔

گالی گلوچ کرنے، جوتا ہاتھ میں اٹھانے سے کون فائدہ ہے۔ انھوں نے تاسف سے کہا۔

آمنہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ضیا ہارے ہوئے جواری کی طرح اکھڑ رہا تھا۔ اس درمیان اس کی گردن مستقل نیچی رہی تھی۔ نیچے دیکھتے دیکھتے ہی وہ اُٹھ گیا تھا۔

تھو ہے! بڑکو نے اس کے پیچھے تھوکا تو بھی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

ــــ اے سُنو!

گھر کے پچھواڑے لگے ارنڈ کے درختوں کے جھنڈ سے آواز آئی تو وہ یوں اُچھلا جیسے کوئی چھل پیری دکھائی پڑ گئی ہو۔ وہ چھل پیری تو نہیں دھواں دھواں چہرے والی ایک مظلوم سی لڑکی تھی جو آنچل میں سے کچھ کھول رہی تھی۔ ایک دم سے سامنے آ گئی۔ ہاتھ میں پکڑے مٹھی بھر مڑے تڑے نوٹ جلدی سے اس کی قمیص کی جیب میں ٹھونسے اور مڑ گئی۔

ضیا نے آنکھیں مٹ مٹائیں۔ شاید یہ آمنہ ہی تو تھی اس کا منہ حیرت سے کھل گیا اور نوٹ نیچے گر پڑے۔ لڑکی کی پشت دور ہو رہی تھی اور شاید کانپ بھی رہی تھی۔

PARAYE CHEHRE

(Collection of Urdu Short Stories)

ZAKIA MASHHADI